قافلہ چلتا رہے گا

(صلاح الدین نیّر۔ فن اور شخصیت)

○

بساطِ گُل ہو یا دامانِ صحرا
جُنوں کا قافلہ چلتا رہے گا

○ صالحہ الطاف

○ ڈاکٹر صابرہ سعید

تاریخ وسنِ اشاعت :	۱۵ر جنوری ۱۹۹۳ء
تعدادِ اشاعت :	ایک ہزار
طباعت :	اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد۔
طباعتِ سرورق :	انتخاب پریس، جواہرلال نہرو روڈ، حیدرآباد۔
ناشر :	صالحہ الطاف ۔ ۷/۸۲۴-۳-۱۱، ملے پلی، حیدرآباد-۵۰۰۰۰۱
ترتیب وتزئین :	صالحہ الطاف
	ڈاکٹر صابرہ سعید
قیمت عام خریداروں کے لئے :	۳۰/= روپے
بک سیلرز ولائبریریوں کے لئے :	۶۰/= روپے

:- ملنے کا پتہ :-

- حسامی بک ڈپو ۔ مچھلی کمان ۔ حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۰۲
- مولف ۔ ۷/۸۲۴-۳-۱۱، جدید ملے پلی ۔ حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۱

فون نمبر :- ۲۲۸۸۰۲
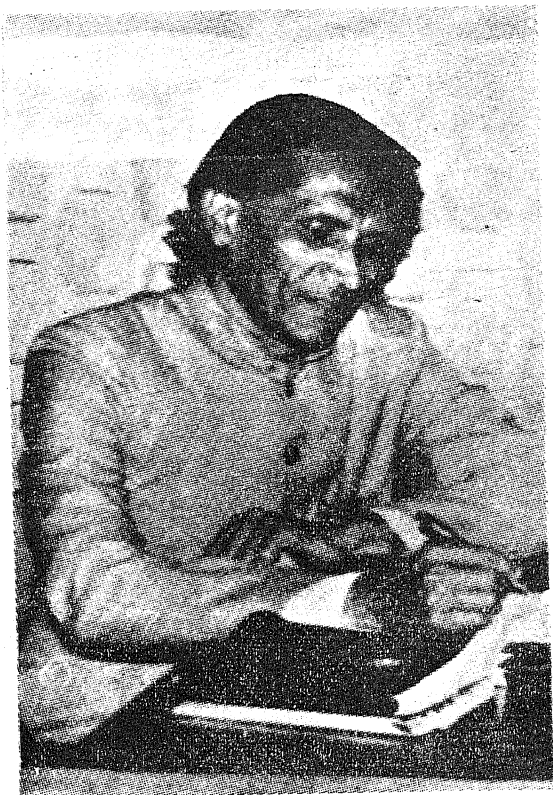
صلاح الدین نیر

اِنتساب

"قافلہ چلتا رہے گا" میں شامل اُن تمام تحریروں اور اہلِ قلم شخصیتوں کے نام جو صلاح الدین نیّرؔ کے فکر و فن کے پارکھ ہی نہیں بلکہ اُن کے طرزِ زندگی سے بھی ہم آہنگ ہیں

اُن بے لوث انسانی رشتوں کے بھی نام
جو نیّرؔ بھائی کی شاعرانہ زندگی کا سرمایہ ہیں

○

صالحہ الطاف

○

ترتیب و تزئین

صالحہ الطاف

صلاح الدین نیّر۔ میرا بھائی
(کچھ باتیں، کچھ یادیں)

میری برسوں کی یہ خواہش تھی کہ نیّر بھائی (صلاح الدین نیّر) کی علمی، ادبی، تہذیبی اور شاعرانہ زندگی پر ممتاز دانشوروں کی تحریروں کو مناسب ترتیب و تزئین کے بعد کتابی شکل دوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب میری برسوں کی تمنا پوری ہو رہی ہے۔

"قافلہ چلتا رہے گا" کے خدوخال کی آراستگی و تزئین میں، اپنی چھوٹی بہن ڈاکٹر صابرہ سعید کی مشاورت و تعاون کو فراموش نہیں کر سکتی۔ اس ضمن میں نیّر بھائی نے بھی مجھ سے تعاون کیا ہے۔

نیّر بھائی کے پہلے مجموعۂ کلام 'گلِ تازہ' کی اشاعت (۱۹۶۵ء) کے بعد سے آج تک اُن کے فن اور شخصیت پر جو کچھ لکھا گیا ہے (جو کچھ تحریریں نیّر بھائی کے پاس موجود تھیں) اُن میں سے منتخب تحریروں کو اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں نیّر بھائی کی کتابوں پر مختلف رسائل، جرائد و اخبارات میں شائع شدہ مضامین، تاثرات اور تبصروں کے علاوہ ان کی کتابوں میں موجود تبصرے

مقدمے، پیش لفظ، تاثرات اور بعض خصوصی مضامین شامل ہیں۔ تنوع اور توازن کی خاطر مضامین کی ترتیب میں تقدیم و تاخیر کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آنے والے کل کا انتظار کئے بغیر صلاح الدین نیر کی ادبی، شعری و تہذیبی زندگی کے نشیب و روز کو دستاویزی شکل میں محفوظ کر دیا جائے۔ مجھے قوی توقع ہے کہ اس کتاب کو بھی نیر بھائی کی دوسری کتابوں کی طرح ادبی حلقے اور عام قاری قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔

نیر بھائی سے میرے ایک دو دن کے نہیں کوئی ۳۰ برس کے پر خلوص مراسم ہیں۔ آج میں نیر بھائی کے بارے میں لکھنے بیٹھی ہوں تو مجھے کتابِ زیست کی ورق گردانی کرنی ہی نہیں ہے بلکہ واقعات کی گمشدہ کڑیوں کو بھی ملانا ہے جو ان برسوں کی دھوپ چھاؤں میں بکھری پڑی ہیں۔

یادیں جو انسان کے ذہن میں محفوظ رہتی ہیں، اُن کے بارے میں ہم جتنا غور کریں، ہمارے دل کو مضطرب کر دیتی ہیں۔ کیا زمانہ تھا وہ جو بیت گیا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہم ماہنامہ "خاتونِ دکن" شائع کرتے تھے۔ نیر بھائی اور میں گھنٹوں اس کی ترتیب و تزئین کے ہر پہلو پر غور کرتے تھے۔ رات دیر گئے تک ہم یہ کام کرتے۔ یہ سلسلہ مسلسل ۱۲، ۱۳ سال تک چلتا رہا۔ بارش ہو کہ سردی و گرمی نیر بھائی بہ پابندیِ وقت کوئی دن ناغہ کئے بغیر آتے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ نیر بھائی کو اپنے کام اور ذمہ داریوں کا کس قدر احساس تھا۔ کام کے دوران مختلف امور پر بات چیت رہتی۔ میری ہر بات کا جواب وہ خندہ پیشانی سے دیتے وہ ہمیشہ ہمارے خاندان کے ایک فرد کی طرح رہے۔ میری ممی، بھائی، بہنیں، بچے

اور الطاف سبھی آپ کے خلوص کی قدر کرتے رہے۔

نیّر بھائی کی ساری زندگی صرف ایک محور پر گھومتی دکھائی دیتی ہے جسے ہم خلوص کا نام دے سکتے ہیں یا پھر ان کی زندگی ایک خوبصورت انگوٹھی کی طرح ہے جس میں ان کے خلوص کا درخشاں نگینہ جڑا ہوا ہے۔

'خاتونِ دکن' میں مضامین، افسانوں، ڈراموں اور اداریہ کا حصّہ میرے ذمہ تھا، نظموں، غزلوں اور پرنٹنگ کا کام نیّر بھائی سنبھالتے۔ سچ پوچھئے تو خاتونِ دکن ہمارا اپنا پرچہ تھا۔ یوں تو عام شمارے پابندی سے شائع ہوتے ہی تھے لیکن ہم نے افسانہ نمبر، ڈرامہ نمبر، غزلیات نمبر بھی شائع کئے ہیں۔ ہمارا مقصد اُردو کے ادبی سرمایہ میں اضافہ کرنا، فن کے ساتھ پورا خلوص برتنا، دل کی باتیں، قلم کی زبان پر لانا تھا۔ آج وقت کے وہ سنگِ میل یاد آرہے ہیں، جو ماضی میں گم ہوگئے ہیں۔ نیّر بھائی کے خلوص کو نبھانے کی میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے۔ لیکن وہ بھی کسی وقت غافل نہیں ہوئے۔ چاہے میں انڈیا میں رہوں کہ انڈیا سے باہر، نیّر بھائی خطوط کے ذریعہ مجھ سے ربط رکھتے۔ ہم ایک دوسرے کا دُکھ درد بانٹ لیتے تھے جیسے بقول نیّر بھائی

ہر زخم اپنی ذات کا آپس میں بانٹ لیں
ہم میں کم از کم اِتنا تو دیوانہ پن رہے

کبھی کبھی نیّر بھائی کا موڈ خراب ہوجاتا تھا، اُنہیں غصّہ بہت جلد آتا تھا۔ جھٹ خفا ہونے کی زیادہ عادت تھی، لیکن میں مطمئن رہتی کہ وہ کتنا بھی مجھ سے کیوں نہ روٹھیں اُنھیں پھر لوٹ کر اپنی آپا کے پاس آنا ہے۔ نیّر بھائی کے خفا ہونے کا انداز بھی مجھے پسند تھا۔

دراصل یہ نیر بھائی کی عمر کا بھی تقاضہ تھا۔ میں یہ اُن دنوں کی بات کر رہی ہوں جب نیر بھائی کی شاعری کا ستارہ عروج پر تھا۔ اور دکن کے تیزی سے اُبھرنے والے شاعروں میں ان کا شمار ہونے لگا تھا۔ Teen ages سے لے کر ہر عمر کے لوگ ان کی نظمیں، غزلیں شوق سے پڑھتے تھے۔ اکثر محفلوں میں ان کے مصرعے زبان زدِ عام، اور محاوروں کے طور پر استعمال کئے جاتے۔ جیسے۔ ع

"نیرا کیا ہوگا اے گُلِ تازہ" - "یہ رات گئی تو بات گئی" وغیرہ

قدرت نے اُنھیں بڑی پیاری آواز سے نوازا ہے۔ ایک واقعہ یاد آرہا ہے جب میں اور نیر بھائی "گُلِ تازہ" مرتب کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ رات کا سماں تھا۔ نیر بھائی سے ایک غزل کی میں نے فرمائش کی کہ آپ اِسے ترنم میں سنائیں۔ (آج تک بھی میری کوئی بات نیر بھائی نے نہیں ٹالی)۔ غزل پڑھنا شروع کی۔ ؎

"شاہجہاں کے تاج محل کو اپنا کہہ کر میں پچھتایا"

آپکی سحر انگیز آواز سن کر میرے بھائی، بہنیں سب نزدیک آگئے۔ آپ نے دوسری غزل چھیڑی ؎

شعر کہتا ہوں ہمیشہ نیرؔ کے طرزِ عام سے
ہر غزل کی ابتداء کرتا ہوں تیرے نام سے

-۲-

جانا تو ہے سب کو لیکن آخر اتنی جلدی کیوں
کب سے میں بیٹھا ہوں سرہانے آنکھیں اپنی کھولو بھی

یوسف ہوں محبت کا خریدار نہیں ہوں
میں اپنی جگہ بزم ہوں، بازار نہیں ہوں

یہ غزلیں بھی سنائیں، پُراثر آواز سے یقین جانئے ایسا سماں بندھا اور یوں محسوس ہونے لگا، جیسے مضراب کی ایک ہلکی سی ضرب سے رَبطِ ہستی کے تاروں کو چھیڑ دیا گیا ہو۔ نغمے خود بخود اُمڈنے لگے۔ وہ رات آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔

اندازِ بیاں صاف ستھرا، لب و لہجہ اثرانگیز، غزلوں اور نظموں میں زمانے کے خد و خال، اور وقت کی چلتی پھرتی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ کہیں تعمیر سے خوشی تو کہیں تخریب سے تڑپ اُٹھنے کا جذبہ۔ یہ دور آپ کی شاعری کا دوسرا دور کہا جا سکتا ہے اس زمانے کے اشعار میں مسائلی اشعار آپ کو زیادہ ملیں گے۔ نیّر بھائی کی ساری زندگی عمل سے عبارت ہے۔ وہ اُردو کے شیدائی ہیں۔ اُردو آپ کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ میر، غالب، حالی اور اقبال کی زبان جو چراغِ گُشتہ کی مانند آج بھی جاری ہے اس کے چشمے جو کبھی اُبلتے تھے، آج خشک ہو رہے ہیں۔ انھیں نئی زندگی دینے کی تڑپ اس شاعر کے دل میں موجود ہے۔

افکار کی چھاؤں میں زمانہ کا عکس، فراق، وصال، امیری غریبی کی کشمکش، زندگی کا تخیّل، اسلوب کی جدت، دل کی عمیق گہرائیوں سے نکلنے والے اشعار تحقیق اور تخلیقِ آرزو کا مطلب ان کے یہاں ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش ہے۔

یوں تو پھول مرجھانے کے لئے ہی ہوتے ہیں۔ مگر یہ چاہتے ہیں کہ اس کی خوشبو میں کمی نہ آئے۔ گل ہائے گوناگوں کا گلدستہ جس میں گلِ تازہ کی مہک ہمیشہ تازہ اور مہکتی رہے۔ یہ اپنی جگہ ایک انجمن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کارواں میں

کئی لوگ شامل ہیں۔

ایسے نغمے بھی انہوں نے اپنے اشعار میں سموئے ہیں جو ہمیشہ محفوظ رہیں گے۔ ان کی زندگی کی ساری وسعتیں ان کی شاعری میں پوری گہرائی کے ساتھ سمٹ گئی ہیں ـــ نیر بھائی خوش نصیب ہیں کہ انہیں اپنی زندگی میں مقبولیت حاصل ہوئی ہے ـــ بہرحال مجھے اپنے اس بھائی پر واقعی ناز ہے۔

پروفیسر ابوظفر عبدالواحد

نگار خانۂ نیّر

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید از حدیثِ دیگراں

گفتہ آید کے بعد کا حصہ حذف کر دیجئے جو رہ جائے وہی میری اس تقریر و تحریر کا اصل موضوع ہے۔ ویسے میرے چہیتوں اور دلبروں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ فضل الرحمٰن، عطاء الرحمٰن، شکور بیگ، میر حسن، مخدوم محی الدین، بشیر النساء بشیر، زینت ساجدہ، حسینی شاہد یہ ہیں چند ایک نام مشتے نمونہ از خروارے جن کے متعلق میں نے ارادی یا غیر ارادی طور پر کبھی کچھ کہا یا لکھا ہے۔

آج کی صحبت میں میں اپنے ایک بہت ہی بے صبرے اور شاگردوں میں سب سے کم سن شاگرد صلاح الدین نیّر کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ نیّر کی شاعری اور اسکی چاہت کا "گل تازہ" آج میرے ہاتھوں برانگندہ نقاب ہو رہا ہے۔ نیّر بڑے اچھے عزائم اور صلاحیتوں کا نوجوان ہے۔ شعر و شاعری سے اُسے شغف ہی کیا عشق ہے۔ بحیثیت انسان وہ بڑا ہی

بے صبرا اور کچھ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی طرح عجلت پسند واقع ہوا ہے۔ یہ ایک لحاظ سے اچھی علامت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اپنی سیماب وشی ہی کی بدولت اس نے اپنے سن سے سوا نام کمایا ہے۔ اور بہت جلد خاصہ نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے۔ "اللہ کرے زور قلم اور زیادہ"۔

ایک فنکار کی حیثیت سے بھی نیر بڑا ہی ذہین اور بے حد فطین شاعر ہے۔ اس نے نظمیں بھی اچھی کہی ہیں اور غزلیں بھی، اور نہ جانے اور کیا کیا لکھا ہے۔ لیکن وہ غزل کا رسیا ہے۔ اس کی شاعری چاہت اور پیار کی شاعری ہے۔ جھوٹی اور بھانامتی پیار کی نہیں۔ "سچے پیار کی"۔ اس نے سچ مچ پیار کیا اور پیار کی صعوبتیں بھی اٹھائی ہیں۔ لوگ شادیاں رچاتے ہیں لیکن پیار کرنا نہیں جانتے۔ پیار کرنا بڑی بات ہے اور سب سے اعلیٰ و ارفع پیار وہ جس کی تان ناکامی و ناآسودگی پر ٹوٹے۔ اسی کا یہ شعر ملاحظہ ہو، جس میں میر و غالب کی سی نشتریت ہے۔ پھر لطف یہ کہ زمین، غالب کی ہے۔

زندگی سے پیار کرنا آگیا نیر مجھے
جب مری آسائشیں گرویدۂ غم ہو گئیں

نیر کوچۂ مومن کا رہ نورد ہے۔ یہ انکشاف میں نے اس کے شاندار دیباچے "سرگذشتِ دل" کے بین السطوری مطالعے اور اس کی غزلوں کی داخلی شہادتوں سے کیا ہے۔ نہ یہ کہ ہمارا نیر کا کوئی یارِ غار ہوں اور از قسم نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کہ جنھوں نے مومن کو عالم آشکارا کیا۔ یہ بھی نہیں کہتا کہ نیر نے مومن کا اتباع کیا ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ اس کی بعض غزلیں مومن

کی غزلوں ہی کی طرح یکسر محاکاتی ہیں یا ماجرائی ہیں ورنہ عام طور پر غزلوں کی فضا کچھ ایسی گھنگور ہوتی ہے کہ اُس سے کسی شاعر کے دل کا بھید پانا دشوار ہو جاتا ہے ۔ بہر حال نیّر کا اسلوب، اُس کا طریقۂ اظہار، اُس کی ماجرائی غزلوں میں بے حد محتاط اور بلیغ ہے۔ مومن بسا اوقات اپنا بھرم گنوا دیتے ہیں یا پھر یہ کہ مومن اپنے زمانے کی زوال پذیر تہذیب کے آئینہ دار تھے۔ نیّر پُروقار رہتا ہے اور اُس کی ذاتی شرافت اُسے بے حجابی کی طرف نہیں اُکساتی۔ وہ سختی سے اُن روایات کا پابند ہے جو اُسے فطری طور پر میرؔ و غالبؔ سے ملی ہیں۔ سچی عاشقی سچی شاعری کی طرح اخفائی ہوتی ہے نہ کہ غوغائی ، ذرا اس شعر کے تیور ملاحظہ کیجئے ؎

اتنے لگے ہیں زخم کہ دل بولتا نہیں
آئینہ اپنا بھید کبھی کھولتا نہیں

عشق اور عفتِ فن سے متعلق اس قسم کے تیز اور چبھتے ہوئے شعر بھی آپ کو "گلِ تازہ" میں جا بجا ملیں گے۔ نیّر کی شاعری کا یہ ثمر نورس جسے اُس نے بڑا ہی شگفتہ اور نظر فریب رومانی نام دیا ہے۔ اپنی ظاہری دلآویزی کے ساتھ اپنے اندر بڑی گہری معنویت بھی رکھتا ہے۔ مخدومؔ کے "گلِ تر" کی شادابی اپنی جگہ مسلّم لیکن نام کی حد تک "گلِ تازہ" کی مجبوبانہ معنویت کا جواب نہیں ہو سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے مجموعۂ کلام "گلِ تر" کی وساطت سے ہی نیّر کے ذہن میں آیا ہو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ ہر نوجوان اپنے پیشرو سے کچھ نہ کچھ سیکھتا ہے۔ دینے سے دیا

چلا ہی کیا ہے۔ بہرحال اپنی کھری اور لطیف معنویت کے لحاظ سے نیّر کا یہ حسین گُل دستہ، اُس کے شعری مجموعے ہی کا نام نہیں بلکہ خود اُس کی مختصر سی حیاتِ شعری کا، حاصل اور اس کی ناآسودہ چاہت کا چمکتا نشان ہے یا پھر بہ قول اُس کے، اُسکی اپنی زندگی کا دوسرا نام ہے، دوسرا نام ہے ..... ہاں وہی انا لیلیٰ والا مضمون ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ خود میاں نیّر گلِ تازہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ چند ایک شعر ملاحظہ ہوں جس سے نیّر کے شاعرانہ فکر اور انوکھی رازداری کے ساتھ گلِ تازہ کے معنوی محبوبی اور کنایہ و مجاز کے پردے میں نیّر کی شاعرانہ آنکھ مچولی کا ماجرا از خود آشکارا ہو جائے گا۔ ذرا سمجھیے اور سونگھیے۔ "مشکِ آنست کہ خود ببوید" ۔ یا پھر اُسکی ایک شادابِ غزل ہی پہلے کیوں نہ دے دوں جس میں نیّر کا سارا ماجرا سمٹ کر ایک منظوم دیباچہ (سرگذشتِ دل) بن گیا ہے اور پھر اس کے بعد جستہ جستہ اشعار دوں گا۔ جن میں اُس خاص الخاص مشارٌ الیہ کی طرف اشارے ہیں۔ لیجئے

غزل ؎

ہر قدم پر ہے مشکلِ تازہ — جب سے بکھرا ہے دل کا شیرازہ
آرزو فصلِ گُل کی کون کرے — گلشنِ دل ہے جب ترو تازہ
صبحِ روشن خریدنے والو — ہے تمہیں شامِ غم کا اندازہ
ڈوبتے ڈوبتے ستاروں نے — چہرۂ شب پہ مل دیا غازہ
ہم تو صحرا نصیب ہی ٹھہرے — تیرا کیا ہوگا اے گلِ تازہ
سب تبسم پرست ہیں نیّر — کس کو ہے میرے غم کا اندازہ

اور لیجئے وہ جستہ جستہ اشعار جس کو اس غزل کے بعد پیش کرنے کا میں نے وعدہ کیا تھا۔ از خود سوچئے کہ یہ سب اہتمام کس لئے اور کس کے لئے ہے ؎

تجھے کس نام سے آواز دوں میں اے گلِ تازہ
یہاں کا ہر شگفتہ گل ترا ہم نام ہوتا ہے

کیسے کیسے پھول دیکھے ہم نے گلشن میں مگر
اُس "گلِ تازہ" کی خوشبو کے سوا کیا یاد ہے

تیرے آج اک گلِ تازہ کی یاد میں
پھولوں کے بدلے راہ میں کانٹے بچھا لئے

کہنا کسی دن اُس گلِ تازہ سے یہ کہنا
ہر سانس میں خوشبوئے وفا پاتو رہا ہوں

گلِ تازہ ہے ہر زخمِ تمنا
محبت کو دعائیں دے رہا ہوں

اب رہا آخری شعر جس میں اپنی روشِ خاص کی طرف نیّر نے اشارہ کیا ہے اور ضمیرِ مخاطب اُسی مشارٌ الیہ کی طرف جاتی ہے۔ جس کا دوسرا نام "گلِ تازہ" ہے ؎

شعر کہتا ہوں ہمیشہ دستِ کے طرزِ سلام سے
ہر غزل کی ابتداء کرتا ہوں تیرے نام سے

نیّر کا مقدمہ خاصہ طویل ہو گیا ہے۔ ابھی چند ایک گوشے باقی رہ گئے ہیں جن کے متعلق میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن تنگیٔ وقت کے باعث کچھ نہ کہہ سکوں گا۔ لہٰذا اپنے کاغذات سمیٹتے ہوئے چند ایک غزلوں کی خواندگی کے بعد چلنے کی برخواستگی کا اعلان کرتا ہوں۔

بہرحال اس طویل طویل مقدمہ کا خلاصہ یہ ہے کہ نیّر کی اُٹھان بڑی شاندار ہے۔ اُن کے مستقبل کے متعلق بھی مجھے بڑی توقعات ہیں۔ اس میں بھی شک نہیں کہ زندگی سے پیار کرنا انہیں بخوبی آگیا ہے لیکن زندگی کے لب و رخسار سے پیار ہی سب کچھ نہیں۔ بقول اقبالؔ ؎

اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زماں و مکاں اور بھی ہیں

٭٭٭

ضمیمہ

(چند معاکاتی غزلیں اور ان کے عنوانات)

اِن غزلوں کے عنوانات میں نے قائم کئے ہیں۔ ان کا انفرادی اور نکیر ماجراتی رنگ، سچی چاہت اور شدتِ احساس کا پتہ دیتا ہے۔ مصرعے دیئے دیتا ہوں۔ انہیں مضمون میں شامل کرنا موجبِ طوالت ہے۔

۱۔ خوددار شیتر — یوسف ہوں محبت کا خریدار نہیں ہوں۔
۲۔ انتظار و استقبالیہ۔ فصلِ بہار آگئی اب بھی نہ آیئے گا کیا
۳۔ نامۂ دلبر نذرِ آتش ۔ جب تمہارے خط کو میں نے نذرِ آتش کر دیا
۴۔ محرومی و خودداری ۔ تمام عمر ہنسی کے لئے ترستے ہیں
۵۔ وداعی ملاقات ۔ چاہتا ہوں کہ جی بھر کے باتیں کروں عمر بھر آپ کا ساتھ ہو یا نہ ہو
۶۔ بیتے ہوئے لمحے ۔ بھیگی بھیگی سی وہی رات کہاں سے لاؤں
۷۔ کوئے یار۔ مقامِ ادب — یہ اُن کی گلی ہے بادِ صبا ! آہستہ گذر آہستہ گذر
۸۔ تلقینِ ضبط۔ شعلوں میں آرزو کے چلنا سنبھل سنبھل کے
۹۔ گلے شکوے ۔ تم مجھ سے کہہ رہے ہو کہ میں خود پسند ہوں

۱۰۔ ہم دونوں ۔ یہ سوچا بھی نہ تھا کہ اک دن بچھڑ جائیں گے ہم دونوں
۱۱۔ احساسِ تنہائی ۔ کب سے وفا کی راہ گذر میں تنہا تنہا گھوم رہا ہوں
۱۲۔ وداعی ملاقات ۔ آجاؤ قریب دل، آؤ یہ رات گئی تو بات گئی
۱۳۔ رنگِ دنیا ۔ کہاں ہیں تہذیبِ نو کے خالق نگاہ، حالات پر نہیں ہے
۱۴۔ وارثِ حیات ۔ پرواز کرنے والوں کے پر ہیں کٹے ہوئے
۱۵۔ نیا احساس ۔ اُڑ گئی نیند خوش نصیبوں کی
۱۶۔ تلاشِ مسرت، نشاطِ غم ۔ تم کو نفس نفس میں مسرت کی ہے تلاش
۱۷۔ یادِ ماضی ۔ کتنے شاداب لبوں پہ ہے فغاں میرے بعد

("گلِ تازہ" کی رسمِ اجراء کے موقع پر یہ مضمون پڑھا گیا)
اردو ہال ۔ ۲۹ر اگست ۱۹۶۵ء

پروفیسر احتشام حسین

زخموں کے گلاب

لفظ اور معنی کا تعلق گوناگوں شکلوں میں اور بہت سی سطحوں پر ادیب اور شاعر کی شعوری جد و جہد اور احساسِ فن سے ادب کے مختلف سانچوں میں ڈھلتا اور ظاہر ہوتا ہے۔ کبھی یہ سانچے بنے بنائے مل جاتے ہیں اور اس کے مافی الضمیر سے مطابقت پیدا کر لیتے ہیں اور کبھی وہ ان میں ترمیم کرتا اور جدید طرز اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دونوں صورتوں میں اس کا ذوق ہی نہیں شعور بھی اس کا اپنا ہوتا ہے۔ یہ تبدیلیاں سماجی تاریخ کے اثر سے خیالوں اور تجربوں کے بدلتے ہوئے دھارے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے خالص ادب کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں کو بھی تاریخی پس منظر اور وقت کے بدلتے ہوئے مزاج کا سہارا لینا پڑتا ہے کیونکہ جذبہ، خیال یا تجربہ خلا میں نہیں پیدا ہوتا۔

صلاح الدین نیرؔ کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے مجموعہ "گلِ تازہ" کی اکثر غزلوں کا محرک ان کا سماجی احساس تھا جس نے کہیں کہیں واضح سیاسی اظہار کی شکل اختیار کر لی تھی اور اس نئے مجموعہ "زخموں کے گلاب" کی تہہ میں بنیادی طور پر زندگی کا وہی شعور کارفرما ہے۔

طرزِ اظہار میں زیادہ ٹھہراؤ، رکھ رکھاؤ، پختگی اور شاعرانہ کیفیت کی نمود ہے۔ ایسا ہونا فطری تھا۔ فن، ریاضت اور اپنے موضوع سے گہری وابستگی کا مطالبہ کرتا ہے۔ تجربہ، حقائق اور تصورات کو نئے نئے انداز میں دیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ گرد و پیش کی بدلتی ہوئی دنیا بدلنے پر وقت کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے پر اکساتی ہے۔ اس لئے اگر شاعر کے یہاں وقت کے ساتھ ترقی نہیں ہوتی تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ اس نے یا تو حالات کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کرلی ہیں یا تھک چکا ہے۔ "زخموں کے گلاب" کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ صلاح الدین نیر نے سوچنا اور آگے بڑھنا بند نہیں کیا۔

اُردو ادب کی تاریخ کبھی اس غلط فہمی کو فراموش نہیں کرے گی کہ کچھ لوگوں نے اپنے خاص قسم کے ذہنی رویہ اور غیر سماجی اندازِ فکر پر پردہ ڈالنے کیلئے تاریخ کے حقائق کا مذاق اُڑانا شروع کردیا ہے جس کی ایک شکل ترقی پسندی کی مخالفت ہے۔ انہوں نے ترقی پسندی کی بنیادی تصویر کو مسخ کرکے اسے محض نعرہ بازی، سیاسی نقطۂ نظر، محدود اور معین طرزِ فکر قرار دے کر یہ رٹنا شروع کردیا کہ یہ ادب ہی نہیں ہے۔ اپنے تبلیغی جوش میں یہ بھول گئے کہ وہ ترقی پسندوں سے بڑھ چڑھ کر منظم انداز میں ایک اور نقطۂ نظر کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ بہت سے باشعور ادیب بھی اس فریب کا شکار ہوگئے ہیں کہ وہ اگر اپنے کو ترقی پسند کہیں گے تو ان پر غیر شاعر ہونے کا ٹھپّہ لگ جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ترقی پسندی کوئی غازہ نہیں جو دھونے سے مٹ جائے۔ اس کا تعلق زندگی کے شعور اور انسانی

ارتقاء پر یقین ہے جس کا اظہار خیالات و افکار میں بھی ہوتا ہے۔ اور طرزِ ادا کے مختلف طریقوں میں بھی۔ اس حیثیت سے اس مجموعے میں بہت سے ایسے پہلو ملیں گے جن کی توجیہہ و تشریح ترقی پسندانہ نظریہ کو سامنے رکھ کر کی جا سکتی ہے۔

صلاح الدین نیّر کا مجموعہ تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں غزلیں ہیں جن کا رنگ و آہنگ موجودہ نئی غزل سے مماثلت رکھتا ہے غزل دل کی لطیف آواز ہے اور اس کے اشعار شخصی اور ذاتی تجربوں کا سبب سے رنگین اظہار کیے جا سکتے ہیں۔ یہاں شاعر اپنے جذبات چھپانے ہی کی کوشش میں نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے اور اس کے دل کا معاملہ الفاظ کے پردوں سے جھانکنے لگتا ہے۔

کچھ شعر جو مجھے اچھے معلوم ہوئے ہیں۔ یہ ہیں۔

برگِ آوارہ کی مانند ہے تنہا تنہا — زندگی ساتھ مرا چھوڑ کے پچھتائی ہے

تم اپنے ہاتھ ذرا سوچ کر بڑھا دیتا — بہت سے ہاتھ کٹے ہیں دراز دستی میں

اجل کے سایے میں بھی پاسِ وضع داری ہے — پڑی ہے پاؤں میں زنجیر رقص جاری ہے

اجل بھی سر بہ گریباں ہے زندگی کے لئے — یہ دیکھنا ہے کہ یہ رات کس پہ بھاری ہے

نہ جانے کب سے مسلسل ٹپک رہا ہے لہو — بہت سے زخم ہیں تہذیب کی نگاہوں میں

ساتھ دے وقت تو اے دوست رگِ گل سے بھی — ظلم کی آہنی زنجیر بھی کٹ جاتی ہے

میرے بدلے ہوئے لہجے کی شکایت کیوں ہے — چوٹ لگتی ہے تو آواز بدل جاتی ہے

کوئی ماحول سہی عہدِ مسرت ہو کہ غم — جن کو جینے کا سلیقہ ہے جیا کرتے ہیں

آنسو ہمارے وقفِ شبِ غم نہ ہو سکے   موتی بنے نہ شرر بنے، شبنم بنے کبھی

آئینہ اپنا بھید کبھی کھولتا نہیں   اتنے لگے ہیں زخم کہ دل بولتا نہیں

مجموعے کے دوسرے اور تیسرے حصوں میں کچھ سیاسی، سماجی، واقعاتی، شخصی اور عشقیہ نظمیں ہیں جن میں صلاح الدین نیّر کے پہلے مجموعے گلِ تازہ کا رنگ کسی قدر پختگی کے ساتھ نمایاں ہے۔ اظہار میں ضبط و نظم اور محسوسات میں شدت ہے۔ بعض نظموں کے مطالعے سے زندگی کی جانب اُن کے رویہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بہت سے شاعروں کے برعکس وہ جرأت رکھتے ہیں کہ قاتل و مقتول، مظلوم و ظالم میں تمیز کر کے بتا سکیں کہ انہیں کن انسانی قدروں سے محبت ہے۔ انہوں نے وقت کے تضاد اور تغیّر کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس کا دامن نہیں چھوڑا ہے جو زندگی بخش ہے۔ ان نظموں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں عمومی جذبات اور عام موضوعات نئے احساس کے ساتھ ادا کئے گئے ہیں۔ یہ فن سے وابستگی اور تجربات کو شاعرانہ نظر سے دیکھنے کا فیض ہے۔ انہوں نے فنی تجربے نہیں کئے ہیں اور اپنی پوری توجہ اپنے مواد کو شاعرانہ پیکروں میں پیش کرنے پر مرکوز رکھی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ مجموعہ بھی ان کے پہلے مجموعہ کی طرح مقبول ہو گا۔

(دیباچہ "زخموں کے گلاب")
۱۹۷۳ء

علامہ منوّر لکھنوی

دورِ جدید کا جواں فکر شاعر

"گلِ تازہ" صلاح الدین نیّر کے جذبات و احساسات کا صحیح آئینہ ہے۔ ان کی ہر غزل میں شعلہ و شبنم کا امتزاج ہے۔ اس میں نیّر مسکراتے ہوئے کبھی نظر آتے ہیں اور آنسو بہاتے ہوئے بھی۔ نیّر کے مزاج کو تغزل سے ازلی اور قریبی نسبت ہے۔ تغزل ان کے رگ رگ میں پیوست ہے۔ اور یہ تغزل رسمی نہیں۔ تغزل اپنے صحیح معنوں میں نظر آتا ہے۔ "گلِ تازہ" میں نیّر کے تجربات، احساسات اور مشاہدات بروئے کار نظر آتے ہیں۔ اور حسین انداز سے انہوں نے اپنے ان تجربات اور مشاہدات کو شعر کے سانچے میں ڈھالا ہے اس میں انفرادیت کی شان پائی جاتی ہے۔ ان کی غزلوں میں رسمی شاعری کا جزو برائے نام کبھی نظر نہیں آتا۔ ان میں زندگی کی حقیقتوں اور ان کے جذبات و احساسات کی ہو بہو اور جیتی جاگتی تصویر، دعوتِ نظارہ دیتی ہے۔ اس سے مصنف کی زندگی کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، اسکی وجہ یہ ہے کہ "گلِ تازہ" کا فنکار اپنے فن کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ دونوں میں کسی قسم کا بُعد نظر نہیں آتا۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گلِ تازہ کا فنکار اپنے فن میں ڈوب گیا ہے اور اس کا فن اسکی فنکارانہ شخصیت کا جزو

بن گیا ہے

صلاح الدین نیّر کی نگاہ میں غم کی بڑی عظمت ہے۔ وہ غم کو مسرت پر ہزار درجے ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا کہنا درست ہے کہ مسرت کے لمحات سطحی ہوتے ہیں اور غموں کی ساعتوں میں بڑی گہرائی ہوتی ہے۔ یہ حقیقت نیّر کے ہر شعر سے ٹپکتی ہے۔ میں نے "گلِ تازہ" کا سیر حاصل مطالعہ کیا ہے۔ پچھلے دو تین سال کے اندر میری نظر سے جدید دور کے اکثر شعراء کا کلام گذرا اور ان کی کاوشِ نظر کے اچھے اچھے نمونے دیکھنے میں آئے ہیں۔ ان نوجوان شعرا کا رجحانِ طبع، قدما اور متوسطین کے رجحانِ طبع سے قطعی مختلف ہے۔ صلاح الدین نیّر بھی جدید دور کے فنکار ہیں۔ ان کی تعلیم اور ان کا ماحول اُن کے فنکارانہ قالب کو ڈھالنے میں بہت کچھ اثر انداز ہوا ہے مگر ان کی مخصوص افتادِ طبیعت نے اس تاثر سے اور ہی کچھ کام لیا ہے۔ اسی لئے دورِ جدید کے شعراء میں بھی نیّر کی غزل کا انداز سب سے جداگانہ نظر آیا۔ نیّر نے گلِ تازہ کے ذریعہ جو سرمایۂ غزل پیش کیا ہے اس کی ایک مخصوص اہمیت ہے، اس کا انداز تقلید اور روایات سے بالکل بے نیاز ہے۔ استعارات و تشبیہات اگرچہ قدیم ہیں پھر بھی ان کا تعلق ہمارے ماحول اور ہمارے کلچر سے ہے۔ ان میں ہندوستانیت پائی جاتی ہے۔ نیّر نے انہیں استعارات و تشبیہات کو ایک نئے رنگ ڈھنگ سے اور ایک نئی تکنیک سے استعمال کیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نیّر کے کلام میں جو کچھ خامیاں ہیں (جن کی تعداد بہت تھوڑی ہے) وہ خامیاں اُن کے کلام کے تاثر اور اُن

ں واحساسات کی گرمی کے آگے ٹھہرتی نہیں۔ اُن کے افکار کے ہجوم
مسیاں گم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اُن کا کلام چونکہ اُن کے دل کی آواز
لئے اس میں خلوص ہے، بناوٹ نہیں۔ اسی لئے بسا اوقات میرا
ں بھی اُن کے جذبات و احساسات میں شریک ہونے کے لئے مجبور

ت کی غزل، فلسفے کی گرانباری سے بوجھل نہیں۔ عرفانیات اس کے
ر سے خارج ہیں۔ سیاسیات سے بھی اس کو کوئی براہِ راست لگاؤ
بھی فلسفہ، عرفانیات اور سیاسیات ان تینوں کی جھلک ایمائی
اتی طور پر ان کی غزلوں میں جا بجا مل جاتی ہے۔
ضو گلِ تازہ کو میں اردو ادب کے بہترین متغزلانہ پہلو کا آئینہ دار
ں۔ اُردو کے قدیم و جدید غزل گو شعراء کی جو فہرست اب تیار
میں تیشہ کا ذکر بھی نمایاں طور پر شامل ہوگا اور ہونا چاہیے۔
گلِ تازہ کا کوئی صفحہ ایسا نہیں جس میں دو چار اشعار ناخن بہ دل
تمام مجموعہ کیا ہر صفحہ پر ایک نہ ایک تیر ایک نہ ایک نشتر نظر آتا
گلِ تازہ کے کچھ ابتدائی صفحات کے جن شعروں نے مجھے زیادہ
ہے ان کا مطالعہ قارئین کی توجہ بھی شاید اپنی طرف کھینچ سکے۔
بات میں ہم کو وہ تمام منازل کے آثار نظر آتے ہیں اور ایک خصوصی
ی انداز و ادا کے ساتھ ان کے دل کی کسک ان کے جگر کا سوز، ان
ستیاق کی تڑپ اور ان کے تصورات و تخیلات کی تشنگی ان کی

غزلوں کے بیشتر اشعار میں پائی جاتی ہے۔ ان کی غزلوں سے ان کی انفرادیت ٹپکتی ہے۔ اُن کی غزلوں میں جذبات واحساسات کی ندرت کے ساتھ محاکات کی ایک ناقابلِ بیان دلفریبی ہے جسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن دائرہ تحریر میں لانا مشکل ہے۔

صلاح الدین نیّر دورِ جدید کے جواں فکر شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے غزل ہی کو آلۂ کار بنایا ہے۔ صنفِ غزل کی محبوبیت مسلّم ہے۔ غزل اپنی تمام ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے۔ نیّر کا شمار تازہ کار کو کہنوں میں ہے جن کی فرہادیت اُن کو آج نہیں تو مستقبلِ قریب میں روشناسِ شیریں ضرور بنائے گی اور ان کی سیماب وشی سے دنیائے ادب نہ صرف متاثر ہو گی بلکہ ان کو خونِ متحرک بنا کر اپنے رگ و پوست کا جزو بنائے گی۔

نیّر نے اپنے مجموعہ کلام کا نام "گُلِ تازہ" رکھ کر اپنی خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے۔ اگرچہ کہ نیّر نے گل تازہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے مگر شاعر کا اندازِ فکر ہر حصے میں یکساں ہے۔ صلاح الدین نیّر کا منفرد اندازِ فکر ہے اُردو غزل میں جو استعارات بالعموم استعمال کئے جاتے ہیں نیّر نے انہیں استعارات سے کام لیا ہے لیکن اُن کا طریقۂ استعمال جدا ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ خوب بھی ہے۔ غرض گُلِ تازہ اُردو کے متغزلانہ ادب کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس نے اُردو ادب میں ایک نئے اندازِ فکر کو جنم دیا ہے اور اس میں قدیم رنگ کے پسند کرنے والوں نیز جدید طرزِ سخن کے شیدائیوں

کے لئے یکساں طور پر ذہنی اختلاط کا ایک ہر طرح سے قابلِ قدر وسیلہ مہیا ہوتا ہے۔ سب سے بڑی خوبی گُلِ تازہ کی یہ ہے کہ اس میں اغلاق و ابہام نہیں ہے۔ ہمیں شعر کو سمجھنے کے لئے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں اور نہ اس کے افہام و تفہیم میں کوہ کندن و کاہ برآوردن کی نوبت آتی ہے۔

'گُلِ تازہ' پر جو کچھ میں نے لکھا ہے نہ وہ تنقید ہے نہ تبصرہ، صرف اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ میرا ایمانا یہ خیال ہے کہ جدید نسل کے شعراء میں نیّر نے اپنی غزلوں کے ذریعہ نئے انداز میں نئی چیزیں دی ہیں اور یہی اُن کی خوبی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہوں:

جب سے بکھرا ہے دل کا شیرازہ — ہر قدم پر ہے مشکلِ تازہ

چہرۂ شب پہ مَل دیا غازہ — ڈوبتے ڈوبتے ستاروں نے

تیرا کیا ہوگا اے گُلِ تازہ — ہم تو صحرا نصیب ہی ٹھہرے

ان اشعار کی محاکاتی کیفیت سے کون نہ متاثر ہوگا۔ خودستائی شاعر کے لئے جائز ہے مگر شاعری کی حدود میں۔ اسی لئے نیّر یہ کہتے ہیں تو بیجا نہیں کہ ؎

پھر بھی تیرے شہر میں ایک بلبلِ شیراز ہے — یوں تو نیّر جیسے کتنے ہی غزل گو ہیں مگر

خودستائی بھی کی ہے تو کتنے تیکھے انداز کی ؎

تمہارے شہر کی تہذیب ہی نرالی ہے — متاعِ ہوش یہاں سب نے بیچ ڈالی ہے

اس مطلع کی مختلف طریقے سے وضاحت کی جاسکتی ہے ؎

چمن میں ذکرِ عنادل میں ڈال ڈالی ہے — حدیثِ برق نشیمن تلک نہیں محدود

کہیں تو میرے ہی ماضی کا آئینہ تو نہیں - تیری یہ بدلی ہوئی شکل دیکھی بھالی ہے

اس غزل کا یہ شعر تو بڑی کیفیتوں کا حامل ہے ؎

نہ جانے بزم سے کس کو اُٹھا دیا تم نے - تمام شہرِ وفا آج خالی خالی ہے

کیا فصاحت و بلاغت میں ڈوبے ہوئے حسب ذیل اشعار ہیں۔ ہمارے سماج، ملک بیز
مے خانے کی تہذیب پہ یہ سخت گھڑی ہے - رندوں میں یہ کیوں آخرِ شب چھوٹ پڑی ہے
خوشبوئے بہاراں درِ زنداں پہ کھڑی ہے - میں ہوں کہ مرے پاؤں میں زنجیر پڑی ہے

اور اس للکار کا انداز بھی کتنا حسین اور برجستہ ہے ؎

اے دوست! یہی وقت ہے ثابت قدمی کا پھر میری وفا آج سر دار کھڑی ہے

یہ اشعار بھی بڑے پیارے ہیں ؎

بے لوث محبت کے تقاضوں کو تو سمجھو - تکمیلِ تمنا کے لئے عمر پڑی ہے
تو ذوقِ سفر سے ابھی واقف نہیں نیّر - کب سے تری منزل ترے قدموں میں پڑی ہے

اگلی دو چار غزلوں کے اشعار بھی ایک نہ ایک کیفیتِ خصوصی کے حامل ہیں۔ بالتفصیل توضیح طوالت طلب ہوگی۔ ان کے نکات قابلِ توجہ ہیں۔

جینا ہے چین سے تو غموں کو بھی پالیئے لیکن نشاطِ غم میں بھی خود کو سنبھالیئے
دنیا خدانہ خواستہ تاریک ہو نہ جائے آنکھوں میں میری اسطرح آنکھیں نہ ڈالیئے
بہت دنوں سے زمانہ ہے گوش بر آواز نظر بچا کے زمانے سے زیرِ لب کہیئے

یہ تمام غزل نیّر کے خصوصی طرز و ادا کی غماز ہے - تمام اشعار نازک ترین جذبات سے مملو ہیں۔ کتنے اچھے شعر نیّر نے اس غزل میں نکالے ہیں - اب میں تسلسل سے گریز کرکے نیّر کی دوسری غزلوں کے اشعار پیش کروں گا جن کو پڑھ کر

میرا دل متاثر ہوا۔

جب تمہارے خط کو میں نے نذرِ آتش کر دیا۔ ایک ایک لفظِ وفا نے دور تک پیچھا کیا
آخری تحریر تھی اُن کی یہ میں نے کیا کیا۔ خود بھی تنہا ہو گیا اُن کو بھی تنہا کر دیا
اے مرے ہمدم! مرے مونس، رفیقِ آشنا۔ جب تک اپنی یاد باقی ہے تجھے بھولوں گا کیا

محبوب کی انجمن میں جانے کیلئے خود ضبطی شرط ہے۔ کتنا نفسیاتی مطالعہ ہے ؎

جب دل کو ضبطِ درد کے قابل بناؤں گا   پھر تیری انجمن میں مسلسل میں آؤں گا

اور پھر ؎

توہینِ عشق ہوتی ہے وعدہ نہ لیجئے۔ اِس بزم میں کشش ہے تو خود کھنچ کے آؤں گا
مجھ کو بھلا سکو تو بھلا دو بصد خوشی۔ لیکن کبھی کبھی میں بہت یاد آؤں گا

دوسرے اشعار بھی قابلِ غور ہیں ؎

کتنا ہی اندھیرا ہو مری راہ گذر میں۔ ہیں نقشِ قدم آپ کے پہچان ہی لوں گا
جب گوشۂ دل میں ہو اندھیرا کبھی نیّر۔ اُن کے لب و رخسار سے کچھ روشنی لوں گا

اور سنئے۔

گھبراؤ نہیں پیار کو رسوا نہ کروں گا۔ تم پاس سے گذرو بھی تو آواز نہ دوں گا
رسوائی کا احساس ہے تم کو اگر اِتنا۔ میں عرضِ تمنا میں بھی محتاط رہوں گا
ہستی کا پرستار ہوں مانوسِ وفا ہوں   اے زندگی! تجھ سے تو سرِ دار ملوں گا

اس غزل کے اشعار میں بھی بھرپور کیفیت ہے۔

یوسف ہوں محبت کا خریدار نہیں ہوں   میں اپنی جگہ بزم ہوں بازار نہیں ہوں
میں سونپ چکا کام نگاہوں کو زباں کا   کچھ روز سے آمادۂ گفتار نہیں ہوں

میں دیکھ لیا کرتا ہوں آنکھوں کو تمہاری جیسے نہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ مے خوار نہیں ہوں
زخموں سے تو پھولوں میں اضافہ ہی ہوا ہے میں باعثِ ویرانی گلزار نہیں ہوں
اور کہتے ہیں۔

آواز دو پھر طرزِ زلیخا نظر آئے کو یوسف تو ہے موجود خریدار کہاں ہے
اپنے سے پشیمان ہے خود ذوقِ نظارہ اس بزم میں سب حاصلِ دیدار کہاں ہے
اے دوست! تبسم کی تمنا تو ہے آساں بھیگے ہوئے دامن کا طلبگار کہاں ہے
شدتِ جذبات سے مملو شعر ایک اچھی اور مشکل زمین میں کہا ہے
آپ دامن نہ بڑھائیں مرے اشکوں کیلئے میرے اشکوں سے کہیں آپ کا دامن نہ جلے
یہ محاکاتی شعر بھی خوب ہے۔

پھول جیسے یہ قدم اور یہ تکلفِ خرام آپ کے پاؤں کی مہندی سے یہ آنگن نہ جلے
بجا ہے مٹی کا پیالہ ہو کہ شیشے کا گلاس آپ کے ہاتھ سے چھو جائے تو سونا ہوگا
اب بھی وقت ہے ذرا سوچ سمجھ لو نیر اُن کو پانا ہے تو خود اپنے کو کھونا ہوگا
رہنے دو مسیحائی بے سود کرم ہوگا یہ دردِ محبت ہے مشکل ہی سے کم ہوگا
اشکوں کی روانی بھی موضوع بدل دے گی جس دن کوئی دیوانہ آسودۂ غم ہوگا
جو سمے بیت گیا بیت گیا، بیت گیا اب وہ ماحول وہ حالات کہاں سے لاؤں
نیر کہہ سکتے تھے۔ وقت جو بیت گیا، بیت گیا، بیت گیا مگر ہندی لفظ سمے کے
استعمال سے شعر میں صوتی حسن پیدا ہو گیا ہے۔

کم از کم تم نہ پوچھو مجھ سے کیسا ہوں وفا کا نامکمل حادثہ ہوں
بہت پہلے سنی تھی کوئی آواز اسی لہجے کو اب تک ڈھونڈتا ہوں

غریبِ شہر مجھ کو کہہ لے دنیا — مگر میں خسروِ شہرِ وفا ہوں

الجھنوں ہی کی توجہ سے نکھرتی ہے حیات — تجھ کو جینا ہے تو حالات سے رنجیدہ نہ ہو

ہم جس مقام پر ہیں اندھیروں کا کیا گذر — یہ جگنوؤں کا شہر اجالوں کا ہے نگر

آنے نہ پائے درد کی لذت میں کچھ کمی — اے تو دلِ غریب کا کچھ تو خیال کر

کتنی عجیب کیفیت کا حامل یہ مطلع ہے۔

راہ میں آپ ٹھہرتے ہیں نہ ہم رکتے ہیں — جب بھی رکتے ہیں تو منزل کے قدم رکتے ہیں

کس دوراہے پہ ہمیں کھینچ کے لائی ہے وفا — سانس رکتی ہے بہ مشکل تو قدم رکتے ہیں

مصلحتیت کی کارفرمائیوں پر خوب طنز ہے۔

تمام عمر ہنسی کے لئے ترستے ہیں — تمہارے شہر میں ایسے بھی لوگ بستے ہیں

نیر نے یہ بات بھی کتنے اچھے پیرایے سے کہی ہے۔

بہت ہی دور سہی منزلِ وفا لیکن — خلوصِ عشق سلامت ہزار رستے ہیں

"کب سے" ان دونوں لفظوں میں زمانہ لا متناہی کی وسعتیں ہیں۔

ہم کب سے منتظر ہیں تجھے یاد بھی نہیں — یہ بھول تو ہے تیری مگر کیسی بھول ہے

بھیگتی رات میں منہ موڑ کے جانے والے — چین سے تو بھی اکیلے میں رہا کیا ہوگا

بے نیازی سے جدا ہو گئے وہ تو نیر — یہ نہ سوچا مری دنیا میں رہا کیا ہوگا

اپنی صورت بھی نہ پہچانی گئی اتنے لئے

ہم تو جاتے ہیں پہ آباد رہے شہرِ غزل

بعض شعروں میں سادہ بیانی ملاحظہ ہو۔

جیسے بھی کچھ ہوں لوگ ہمیں جانتے تو ہیں
آوارگانِ شہر کو پہچانتے تو ہیں

یہ اور بات ہے کہ تجھے پا نہیں سکے
ہم کائنات تیرے لئے چھانتے تو نہیں

اِس شعر میں حسرت و یاس کا کتنا شدید جذبہ ہے۔

وہ چراغ، کل شب کو بجھ گیا سرِ محفل
جس کو ڈھونڈتے ہو تم آج کے اُجالوں میں

مجھے یقین ہے کہ صلاح الدین نیّر کا یہ کارنامہ اُردو ادب کے گلستان میں "گلِ تازہ" کی طرح سدا بہار رہے گا۔

(۱۸/اپریل ۱۹۶۷ء)

پروفیسر ہارون خاں شروانی

گُلِ تازہ کا خالق

میں "گل تازہ" کے خالق صلاح الدین نیر سے کئی سال سے واقف ہوں۔ اردو مجلس میں اُن کی سُریلی آواز اور چبھتے ہوئے شعر سنتا رہتا ہوں۔ مگر معلوم نہ تھا کہ اُن کی غزلوں کے کسی مجموعے پر مجھے رائے زنی بھی کرنی پڑے گی۔ جب وہ مہربانی سے اپنی نئی کتاب 'گلِ تازہ' کا ایک نسخہ میرے پاس لے کر آئے۔ اُس وقت بھی انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار نہیں کیا کہ مجھے اس پر کچھ لکھنا پڑے گا۔ چنانچہ کتاب کو جستہ جستہ دیکھا۔ کہیں کہیں اس پر پنسل سے نشان کئے اور نمبر لگا کر اپنے کتاب خانہ میں اسے رکھ دیا۔ چند روز ہوئے ٹیلیفون آیا کہ میں کتاب پر کچھ رائے لکھوں۔ میں نے غور کیا کہ میں نے اس نقطۂ نظر سے کتاب نہیں دیکھی مگر میرا عذر مسموع نہ ہوا۔

اول تو کتاب کا نام ہی ذرا سوچ میں ڈال دینے والا تھا لیکن کتاب کے دیباچے سے جسے سرگذشتِ دل کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، یہ بات صاف ہوگئی۔ نیر صاحب نے اس مجموعے میں صرف حال کی غزلیں جمع کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ کتاب

کے تین حصے ہیں اور ہر ایک حصے کی ابتدا ایک خوبصورت قلمی تصویر سے کی گئی ہے۔ پہلے حصہ کو 'اوراقِ گُل' کا نام دیا گیا ہے۔ اور تصویر کے نیچے یہ شعر لکھا ہے

زندگی میری بظاہر اک شکستہ ساز ہے
سُننے والوں کے لئے آواز ہی آواز ہے

بہت سے شاعر اپنے اشعار میں تعلّی اور خودستائی کی بھرمار سے نہیں اکتاتے مگر یہاں شاعر کہتا ہے کہ اگر آپ کسی نغمے کو ڈھونڈتے ہیں تو آپ کو اس سے کیا ملے گا۔ یہاں تو الفاظ دل سے نکلے ہیں۔ ان میں جو کیف پنہاں ہے وہ سمجھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔

دوسرا حصہ 'حکایتِ گُل' ایک اور تصویر سے شروع ہوتا ہے جس پر تحریر ہے ؎

میں خود ہی بے نیازِ بادہ و پیمانہ ہو جاؤں
کچھ اس انداز سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال دے ساقی

تصویر ایک خوبصورت لڑکی کی ہے، جو بڑے الھڑپن سے جام پیش کر رہی ہے مگر شاعر کہتا ہے کہ مجھے مدہوشی کے لئے جام کی خواہش نہیں۔ اگر تو میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر صرف ایک مرتبہ میری طرف دیکھ لے تو یہ میرے خمار کے لئے کافی ہے۔

تیسرے حصے "زخمِ گُل" کی ابتدا بھی ایک تصویر سے ہوتی ہے۔ زخمِ گُل کی ترجمانی اس حصہ کی پہلی غزل کا مقطع کرتا ہے

نیّر بیانِ درد سے کچھ فائدہ نہیں ۔ یہ اہلِ بزم اتنے کہاں دردمند ہیں

مگر ساتھ ہی

جو گرمیٔ حالات سے تپتا رہا تیر۔ فنکار وہ ہر دور میں مقبول رہا ہے

یہ زندگی کا اُتار چڑھاؤ، اچھائی برائی، یہ خوشی اور غم لازم و ملزوم ہیں۔ یہ ایک ساتھ پیدا ہونے والی کیفیتیں ہیں اور قدم قدم پر ان کے تقائق کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے

رخصت اے تیرگیٔ آخرِ شب
جگمگاتا ہے چہرۂ خورشید

کتاب کے پڑھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جو اشعار اس میں شامل ہیں وہ شاعر کے دل سے نکلے ہیں اور اس اعتبار سے بقول شاعرِ مشرق" اثر رکھتے ہیں۔ یہ مجموعہ نقشِ اول ہے۔ اُمید کہ نقشِ ثانی اس سے بھی بہتر ہوگا۔

(۱۹۶۵ء)

-۲-　　-۲-　　-۲-

ڈاکٹر طاہر علی خاں مسلّم

گُلِ تازہ

میں نیر صاحب سے سب سے پہلے بزمِ سعدی کے پہلے اجلاس میں متعارف ہوا اور وہیں اُن کی فارسی غزل سنی جو مجھے پسند آئی اور توقع بندھی کہ مشقِ سخن کے ساتھ پختگی کے مدارج بھی طے ہوں گے ۔ اس کے بعد ان کا اُردو کلام بھی جب اور جہاں موقع مل جاتا شوق سے پڑھ لیا کرتا۔ اُن میں شعری صلاحیتیں، قسّامِ ازل کی ودیعت تھیں جو بتدریج ترقی کرتی گئیں اور ذوق اور کاوش نے اپنا حصّہ ادا کیا۔ امتدادِ ایّام کے ساتھ، حُسنِ کلام کے ساتھ متانت اور پختگی بھی پیدا ہوئی اور ترقی کر رہی ہے ۔ مجھے ان کے کلام کے ساتھ پہلے پہل جو لگاؤ ہو گیا تھا وہ قائم رہا اور ترقیِ فن کی اُمید نے اس کو قائم رکھا۔

تنقید اور خصوصاً فنِ لطیفہ کی تنقید، اپنی پسند یا ناپسندیدگی کی تاویل یا اظہارِ خیال کا ایک رُخ ہے جو ظاہر ہے کہ ' OBJECTIVE ' نہیں ہے۔ دوسرا رُخ اس کا فنونِ لطیفہ کی تکنیک سے متعلق ہوتا ہے۔ اگر کوئی ماہر خدوخال کی تنقید کرے تو یہ ممکن بھی ہے اور قابلِ فہم بھی بشرطیکہ پڑھنے

والا بھی کسی فن کی ٹکنک یا ہیئت ترکیبی سے کم و بیش واقف ہو اور واقعہ یہ ہے کہ اس سے کم پڑھنے والے واقف ہوتے ہیں۔ شعر کے کئی اصناف ہیں اور ہر صنف کی ایک خاص ٹکنک ہے۔ کسی فن کی خارجی نوعیت اور اس کے اصول و قوانین علم ہیں۔ اگر کوئی اس علم سے واقف ہو تو نقطۂ نظر سے دوسروں کو مستفید کر سکتا ہے۔ لیکن اسی علم کا داخلی پہلو کسی فن کی روح سے متعلق ہوتا ہے اور روحِ فن، فنکار کا قطعاً انفرادی سرمایہ ہے جو تنقید کی گرفت سے بالکلیہ باہر ہے۔ ایک مغنی یا شاعر سے یہ کہنا کہ ایسا راگ کیوں گایا یا ایسا شعر کیوں لکھا غلط ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے بے وقت اس راگ کو گایا یا شعر وزن سے گرتا ہے تو اس کا ناقد کو حق ہے اور یہ تنقید روح سے نہیں جسد سے متعلق ہے جس کے اظہار کا ایک ماہر فن کو حق ہے لیکن یہ کہنا کہ فن کار نے جذبات و احساسات کی صحیح ترجمانی نہیں کی، قطعاً غلط ہے کیونکہ زیادہ سے زیادہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ خاص راگ یا راگنی یا شعر آپ کو پسند نہیں ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ دوسرے اس سے محظوظ ہوں اور اس کو پسند کریں۔

میرے شخصی تاثرات گلِ تازہ کے بارے میں اس لئے اچھے ہو سکتے ہیں اور یقیناً ہیں کہ میں ان سے محظوظ ہوا۔ بعض اشعار نے مجھے مسرت بخشی ہے۔ بعض نے مجھے محزون کیا۔ اگر میں اپنی پسند کے اشعار یہاں لکھوں اور اسباب وغیرہ ان کے اچھے ہونے کے بیان کرنے کی کوشش کروں تو یہ کیسے مان لوں کہ یہی اشعار دوسروں کو اسی طرح محظوظ کریں گے مجھے یقین ہے کہ ایک نوجوان شاعر کی سعی و کاوش جو منصۂ شہود پر آئی ہے صاحبانِ ذوق و فن کا دل موہ لینے میں کامیاب ہوگی اور گلِ تازہ مقبول ہوگا۔ (۱۹۶۵ء)

عابد علی خاں

مدیر روزنامہ سیاست

خوشبو کا سفر

صلاح الدین نیّر کا پانچواں مجموعہ کلام "خوشبو کا سفر" آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ دس پندرہ سال میں پانچ مجموعے یقیناً اہمیت رکھتے ہیں، جو تعجب فوراً ہی خیال پیدا ہوتا ہے زُود گوئی اور معیار میں آیا کوئی توازن برقرار رہتا بھی ہے؟ یہ سوال نیّر کی شاعری کی کسوٹی ہے

کئی مرتبہ مجھے نیّر سے کہنا پڑا کہ سروجنی نائیڈو کی سالگرہ تقریب منعقد ہو رہی ہے، آریہ بھٹ فضاء میں داغا گیا ہے، شہر میں کرفیو ہے، حیدرآباد کی تہذیب متاثر ہو رہی ہے، نیا سال آرہا ہے اور تمہیں شعر کہنا ہے۔ نیّر نے ہر ایسے موقع پر شعر کہے ہیں، محفلوں میں پڑھا ہے اور خوب داد و تحسین حاصل کی ہے۔ نیّر کی شاعری اسی خصوصیت سے عبارت ہے۔

نیّر حیدرآباد کے ہر مشاعرے کے نہ صرف ایک لازمی شاعر ہیں بلکہ ادبی ٹرسٹ اور شنکرجی میموریل سوسائٹی کے کُل ہند مشاعروں میں پہلے پڑھنے والے بھی وہی ہیں۔ وہ تقدیم و تاخیر سے بے نیاز ہیں، وہ اپنے کلام اور ترنم دونوں سے مشاعرے

کی قصداً بناتے ہیں۔ آج کسی شاعر کے کلام کے جائزہ کے لئے اس کا مطالعہ اور اس کی سماعت دونوں ضروری ہیں، اور ان دونوں اعتبار سے نیّر نے اپنا ایک منفرد مقام بنالیا ہے۔ نیّر کی شاعری کے بارے میں نقاد اور شاعر، تنقید اور تبصرہ کرتے رہیں گے۔ مجھے صرف ایسے شاعر کا تعارف کرانا ہے جو ایک اچھا شاعر ہے مشاعروں کا لازم و ملزوم اور جو مشاعروں کے انتظام کا روحِ رواں بھی ہے۔ شہر اور اضلاع کے ہر چھوٹے بڑے مشاعرے کے انعقاد میں نیّر کا لازمی حصّہ رہتا ہے ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں میں شعراء کی میزبانی میں وہ میرے معاون و مددگار ہیں "سیاست" کے حصّہ شعر کی ترتیب میں وہ مسلسل تعاون کر رہے ہیں اور ان سب سے زیادہ ادبی ٹرسٹ اور بک ڈپو کے کام میں وہ تنہا میرے معاون ہیں۔ ان کی زندگی کا بڑا حصّہ شعر و ادب کی خدمت میں گذرتا ہے اور ان کی صبح "سیاست" سے شروع ہو کر شام یہیں پر ختم ہوتی ہے۔ وہ حیدرآباد کی شعری اور ادبی سرگرمیوں کے ایک سرگرم رکن ہیں۔

نیّر کا نیا مجموعۂ کلام ان کی ادبی سرگرمیوں اور تخلیقات کا ایک نیا تحفہ ہے، ان کا شعر اُن کی دھڑکن اور حیدرآباد کے حال و ماحول کا آئینہ بھی ہے اور اس کے نقاد کو خوشی ہوگی کہ نیّر کسی لیبل کے بغیر بھی عصرِ حاضر کا ایک حساس شاعر ہے۔ یہی نیّر کا کلام اور پیام ہے۔

(دیباچہ - خوشبو کا سفر - ۱۳؍ ڈسمبر ۱۹۸۳ء)

سید ہاشم علی اختر

سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

صلاح الدین نیّر

کسی شاعر یا ادیب کے ہم عصر اُس کے فن اور شخصیت کے اظہار میں پوری طرح سے غیر جانبدار نہیں ہو سکتے، اِس لئے کہ اُن کے تجزیے میں ذاتی تعلقات، مصلحت مروّت، رشک و حسد، سماجی درجے اور دوسرے عوامل شامل ہو جاتے ہیں۔ اِسی طرح خود نوشت سوانح حیات لکھنے والے کی انا۔ اپنی اہمیت کے احساس اور اپنی زندگی کے کرب اور لذت کی یادوں میں دوسروں کو شریک کرنے کی خواہش بھی شامل ہو سکتی ہے۔

صلاح الدین نیّر کو اپنی سوانح حیات "سلسلہ پھولوں کا" لکھنے کا خیال اُس وقت آیا جب گلبرگہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو نے ایک ریسرچ اسکالر سے اِن کی شاعرانہ زندگی کے موضوع پر مقالہ لکھوایا۔ خیال کے ساتھ ہی ایک فرقہ وارانہ فساد کی شدت کے طویل دوران میں کرفیو کی وجہ سے اُنہیں اس کی فرصت بھی ملی۔

اِس سوانح کے مطالعہ سے متوسط طبقے کے ایک ایسے حساس ہندوستانی کی زندگی کا حال ملتا ہے، جو محض دن کاٹنے کو زندگی نہیں سمجھتا۔ یہ ایک پُر خلوص اور شائستہ انسان کی داستان ہے جو خاندانی اور پیشہ کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ

لوگوں کی مدد کو اپنا شعار سمجھتا ہے۔ بے حساب لوگوں سے تعلقات رکھتا ہے۔ بیسیوں اداروں میں کام کرتا ہے اور بغیر کسی معاشی فائدے کے اپنے آپ کو معروف رکھتا ہے۔ اِس میں انا کے بجائے خود داری ہے۔ خاکساروں سے خاکساری کا اظہار ہے اور سربلندوں سے انکسار بالکل نہیں ہے۔ اِس میں افرادِ خاندان کے علاوہ بہت سی شخصیتوں کا ذکر ہے۔ لوگوں کی مدح زیادہ ہے اور تنقید اگر ہے تو مذمت کی شکل اختیار نہیں کرتی۔ اگر کہیں تعلّی بھی ہے تو جائز نظر آتی ہے۔ اُن کی ادبی زندگی کے ارتقاء میں شخصیتوں کے علاوہ بہت سے ادبی اداروں سے ربط اور اخبار و رسائل خصوصاً سیاست کا بڑا حصّہ ہے۔ اس کتاب کا سب سے دلچسپ حصّہ تخلیقِ شعر کے محرکات ہے۔ جہاں ایک حساس شاعر کی حُسن پرستی اور ادا پسندی کے بہت سے لطیف اور دلآویز واقعات بیان کئے گئے ہیں، لیکن یہ انسانی رشتے کبھی راکھی کے بندھن سے بندھے ہوئے ہیں تو کہیں پدرانہ محبت کا رنگ لے لیتے ہیں۔ بہرحال اِس سوانح عمری کی بدولت بہت سے نام اور شخصیتیں اور بہت سے جمالیاتی حادثے محفوظ ہو گئے ہیں۔

اِس قدر معروف زندگی کے بعد (۸) شعری مجموعے تیر کی پُرگوئی کا ثبوت ہیں۔ بقول یوسف حسین خاں "شاعر اپنی تخلیق کا موادِ خام تحتِ شعور سے حاصل کرتا ہے، اور اُسے اپنے تجربوں میں سمو کر اِس طرح پیش کرتا ہے کہ اُن سے عالم گیر تجربے کی ترجمانی ہوتی ہے۔" خود تیسر کے الفاظ میں اُن کی شاعری شخصی اور ذاتی واقعات اور کسی اہم یا غیر اہم واقعہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اُن کی غزلیں حُسن و عشق کی کیفیات اور واردات کے علاوہ زندگی کی حرارت، صحت مند روایات، کلاسیکی اقدار کی پابندی۔ عصری آگہی۔ فکر و خیال کی پہنائی۔ سرِ شام کی سرگوشیوں۔ چاند کی ٹھنڈک۔ سورج کی گرمیٔ

بادِ صبا کے جھونکے۔ شبنم کے آنسو۔ رشتوں کی پہچان۔ محبت اور رواداری۔ چاہنے اور چاہے جانے کی تمنا اور حقیقت پسندی کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی شاعری اور ترنم کے خوبصورت امتزاج سے یہ ہر دل عزیز شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

اِن کی حقیقت پسندی کا واسطہ دیکر میری یہ تمنا ہے کہ ان کا یہ خوبصورت کلام اُن کروڑوں ہندوستانیوں تک پہونچ جائے جو اُردو بولتے ہیں۔ اُردو شعر گاتے اور گنگناتے ہیں، اُردو کے فلم اور ٹی وی سیریل شوق سے دیکھتے ہیں لیکن بدلے ہوئے حالات میں اُردو پڑھ نہیں سکتے۔ میری یہ درخواست ہوگی کہ وہ اپنی منتخب غزلیں اور نظمیں دیوناگری رسم خط میں بھی شائع کریں تاکہ اُن کے فن کے کمال سے ہر ہندوستانی محظوظ ہو سکے اور اُن کے چاہنے والوں اور اُردو پڑھنے والوں کا دائرہ بہت وسیع ہو جائے۔

اُردو شاعر جو رسم خط جاننے والوں کی تعداد میں ناپید حد تک کمی کی وجہ سے ایک نہایت ہی محدود حلقہ اثر بنا سکتے ہیں، موجودہ زمانے کی الکٹرانک ایجادات سے استفادہ کر سکتے ہیں اور اپنے آڈیو اور ویڈیو کیاسٹس کے ذریعے بے علم لوگوں تک بھی پہونچ سکتے ہیں۔ تیّر کا کلام اور ترنم اِس تجربے کے لئے بے حد موزوں رہیں گے۔

پروفیسر رفیعہ سلطانہ

عصری آگہی کا نقیب

پچھلی چار یا پانچ دہائیوں میں یعنی جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد حیدرآباد کی مسندِ شعر پر جن شاعروں کا سکّہ چلتا رہا، نیّر اسی کارواں کے راہی ہیں جنھوں نے اپنے منفرد لب و لہجہ کی وجہ سے اردو شاعری کو ایک نئی لذت اور نئی ہیت سے آشنا کیا۔ کہنے کو ان کی شاعری کی عمر بہت چھوٹی ہے یعنی تقریباً تین دہائیاں، لیکن اِس عرصے میں ان کے چھ مجموعے اِس امر کے شاہد ہیں کہ نیّر کی یہ استعداد وہبی و عطیۂ خداوندی ہے۔ نیّر کی شاعری ایک محدب آئینہ ہے جس پر نئی طرح کی شعاعیں عکس ریز ہیں۔ ان میں ان کی اپنی شعاع چھن کر صاف نظر آتی ہے یعنی جہاں یہ اختر شیرانی، فیض، مجاز، ساحر کی روایتوں کے امین ہیں وہیں جوش، سردار جعفری کی جراحتوں کے بھی نقیب ہیں۔ نیّر کو میں نے مشاعروں میں بھی سنا ہے اور اُن کا کلام بھی پڑھا ہے۔ ان کی شاعری کے جن پہلوؤں نے مجھے متاثر کیا ہے وہ ان کی عصری آگہی ہے۔ جناب عابد علی خاں نے بڑے لطیف اور ہلکے پھلکے انداز میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اُنہوں نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ جب کوئی زمانہ ساز سیاسی یا

تہذیبی، سائنٹفک واقعہ ظہور پذیر ہو رہا ہو تو وہ نیر سے فرمائش کرتے ہیں کہ وہ نظم لکھیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ فرمائشی شاعر ہیں بلکہ یہ ثبوت ہے ان کی عصری آگہی کا۔ نیر کی شاعری تہہ دار ہے اور اس میں شرابِ دوآتشہ کا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے یہ اشعار۔

زندگانی پھر ترے آئینہ خانوں کے لئے ۔ پتھروں کے شہر سے ایک جا کے ٹکرائے گا کون
جب سے ہے چشم کرم ہم پر نئے حالات کی ۔ آپ جیسے دوست بھی ملنے سے کترانے لگے
اعلیٰ ظرفوں کی جگہ کم ظرف جب پانے لگے ۔ اپنا آنگن چھوڑ کر مرکز سے ٹکرانے لگے
بدنصیبی دیکھئے آوارگانِ شہر کی ۔ اپنی گلیاں چھوڑ کر اوروں کے گھر جانے لگے

موخر الذکر شعر میں نوجوانوں کے ترکِ وطن پر کس قدر خوبصورت طنز ہے۔ ان چند اشعار سے نیر کی شاعری کی اس حیثیت کا پتہ چلتا ہے، جس نے ان کی شاعری کو خاص رنگ و آہنگ بخشا ہے۔

نیر نے اپنے دور کی روح کے شعور و کرب کو اپنی شاعری میں سمو دیا ہے اور جب اس کرب و شعور کو شعر میں بیان کیا تو قاری نے محسوس کیا کہ یہ وہی بات اور احساس ہے جسے وہ اپنے باطن کی گہرائیوں میں محسوس کر رہا ہے۔ یہ دروں بینی اور کیفیات کی ترجمانی نیر کی شاعری کا وہ وصف ہے جو انہیں معاصر شعراء میں ممتاز کرتا ہے۔ نیر نے غزلیں بھی لکھی ہیں اور نظمیں بھی۔ غزلوں میں ان کا انداز زیادہ تیکھا ہے یعنی وہ غمِ جاناں کے روپ میں غمِ دوراں کو گلے لگاتے ہیں نیر کی شاعری میں ساحر اور کیفی کی طرح رشتوں کی مہک ہے۔ مجموعہ کا نام صحیح معنوں میں متن کی عکاسی کرتا ہے۔ (تبصرہ۔ رشتوں کی مہک ۱۹۸۶ء)

-- --

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

گلِ تازہ ۔ صنم تراش ۔ خوشبو کا سفر

جوشؔ نے یوپی میں جون، جولائی کی اُمس کے بارے میں کہا تھا۔

" وہ حبس ہے کہ لُو کی دعا مانگتے ہیں لوگ "

لیکن سرکاری دفتروں میں جو گھٹن ہوتی ہے اُس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو وہاں کام کرتے ہیں، ایسے میں قحط پڑا ہے پڑے نہ پڑے یاروں کو عشق کی یاد کہاں رہتی ہے۔ لیکن ہندوستان بہرحال معجزوں کا دیس ہے اور آج بھی معجزے آئے دن ہوتے رہتے ہیں چنانچہ صلاح الدین نیّر ایسا ہی معجزہ ہے۔ اس نے اپنی زندگی کو دو خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک سرکاری ملازمت کا خانہ بلکہ سرد خانہ ہے اور دوسرا شعر و نغمہ کا خانہ ہے۔

' حافظا در مجلسے دُرد سے کشم در محفلے '

والی بات صلاح الدین نیّر پر صادق آتی ہے۔ دیکھئے نا! اس نے اپنا پہلا شعری مجموعہ " گلِ تازہ " ۱۹۶۵ء میں پیش کیا، پھر ۱۹۷۳ء میں " زخموں کے گلاب " لے کر قارئین کی محفل میں پہنچ گیا اور اب " صنم تراش " لے کر آپ کے سامنے کھڑا ہے۔

صلاح الدین نیّر بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے اور غزل کی تخلیق کے بارے

میں اس کا نظریہ یہ ہے ؎

دامنِ گنگ و جمن لاکھ دل آویز سہی - سامنے تاج محل ہو تو غزل ہوتی ہے
خونِ ارماں ہو تو ہوتے ہیں سلگتے ہوئے شعر - خونِ دل اشک میں حل ہو تو غزل ہوتی ہے

نیّر کی غزل میں "خونِ ارماں" کے سوز کے ساتھ غزلیاتی ترنگ اُس گُلِ تازہ کی دین ہے جو اُس کی شاعری میں جھلکتی ہے اُسی گُلِ تازہ نے اس کی پلکوں کو نمی، اس کے دل کو گداز، اس کی فکر کو اضطراب اور اُس کے قلم کو جادو بخشا ہے۔ "گُلِ تازہ" سے متعلق اس کے اشعار دیکھیے۔

ہم تو صحرا نصیب ہی ٹھہرے - تیرا کیا ہوگا اے "گُلِ تازہ"
گُلِ تازہ ہے ہر زخمِ تمنا - محبت کو دعائیں دے رہا ہوں
رسوا نہ بہاروں میں رہے گا نہ خزاں میں - نیّر گُلِ تازہ کی امانت مرا فن ہے
کھل کے کہو نزدیکِ رگِ جاں کیا وہ گُلِ تازہ تو نہیں
کس کے لئے کہتے ہو نیّر! ایسے درد بھرے نغمات
مجھ پہ احسان سہی اب میں کہاں سے لاؤں - وہ گُلِ تازہ جسے بادِ صبا مانگے ہے
موسمِ گُل میں بھی نیّر میں تہی دامن رہا - سب ہیں گلشن میں مگر میرا گُلِ تازہ نہیں
کیسے کیسے پھول دیکھے ہم نے گلشن میں مگر - اس گُلِ تازہ کی خوشبو کے سوا کیا یاد ہے

اس آخری شعر سے تو "بسیار خوبیاں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری" کی بو آتی ہے اسی لئے تو اپنے پہلے مجموعہ کلام "گُلِ تازہ" کے انتساب کے وقت نیّر کو ایک اُلجھن درپیش تھی اس کا حل اُس نے یہ نکالا کہ انتساب کو سوالیہ نشان بنا دیا اور یہ اعلان کر دیا کہ اس سوالیہ نشان کے پیچھے "گُلِ تازہ" ہی ہے اور وہ لوگ بھی

ہیں جنھوں نے ایک لمحہ کے لئے ہی سہی نیّر کے بارے میں سوچا ہے۔

اختر شیرانی کی سلمیٰ تو ایک تصوراتی کردار ہے۔ شاعر نے اپنے خیالوں میں اس بت کو تراشا ہے اور پھر اپنے دل کی دھڑکنیں اس میں بھر دی ہیں لیکن نیّر کا "گلِ تازہ" ایک جیتا جاگتا وجود ہے جس نے اسے وہ مقامِ عشق عطا کیا ہے جو اس کی شاعری کی روح ہے۔ یہاں نیّر کے دل کی دھڑکن اس گلِ تازہ کی دین ہے۔ نیّر کی شاعری کے اضطراب کے راز کو جاننے کے لئے آپ کو اس کے اندر جھانک کر اس کی تشنہ لبی کو دیکھنا ہوگا جس میں وہ آسودگی کی تلاش کرتا ہے۔ اس کی وفا کا جائزہ لینا ہوگا جس کا وہ نامکمل حادثہ ہے۔ یہی آسودگی تشنہ لبی اس کی شاعری کا مرکزی خیال ہے۔ میدانِ عشق ہو کہ کارزارِ حیات دونوں ہی محاذوں پر وہ بے قرار ہے۔ وہ وفا کا نامکمل حادثہ ہے۔

صلاح الدین نیّر غزل کا شاعر ہے۔ اس نے موضوعاتی بھی اور رومانی نظمیں بھی کہی ہیں۔ اس کے دوسرے مجموعے 'زخموں کے گلاب' میں 'کون قاتل ہے'، گاندھی ازم (میں سوچ رہا ہوں کہ گاندھی کا نام لوں کہ نہ لوں) وہ ایک لمحہ، ماں کے آنسو جیسی اچھی موضوعاتی نظمیں موجود ہیں لیکن نظموں کے میدان میں بھی اس کی رومانی نظموں کا پلّہ بھاری ہے۔ تیسرے مجموعہ کلام 'صنم تراش' میں نیّر نے حصہ نظم میں زیادہ تر رومانی نظمیں ہی شامل کی ہیں جو اس بات کا اعتراف ہے کہ خود اسے بھی رومانی نظمیں پسند ہیں۔

نیّر کی شاعری میں جہاں عشق اور رومان کی نغمگی ہے وہیں جہدِ حیات کا سوز بھی ہے اور ان دونوں کی لطیف ہم آہنگی نے اس کی شاعری کو وہ رنگ

دیا ہے جو اس کا اپنا ہے۔ یہی تو ترقی پسندی کی پرچھائیاں ہیں۔
نشتر نے شعر کہنے کے انداز میں کوئی نیا تجربہ نہیں کیا لیکن اس کے شعروں کے مفہوم میں جو نئی پرتیں پیدا ہوگئی ہیں وہ ترقی پسند رجحانات کی دین ہیں جو نشتر کا اثاثہ بن گئی ہے۔

"گلِ تازہ" کے یہ شعر تو آپ کو یاد ہی ہوں گے ؎

مے خانہ کی تہذیب پہ یہ سخت گھڑی ہے ۔ رندوں میں یہ کیوں آخر شب پھوٹ پڑی ہے
نہ جانے بزم سے کس کو اٹھادیا تم نے ۔ تمام شہرِ وفا آج خالی خالی ہے
پلکوں میں چھپا لوں گا امڈتے ہوئے آنسو ۔ لیکن ترے دامن کو میں آواز نہ دوں گا
میں زندگی سے بچ کر آیا تھا میکدے میں ۔ اسکی کمی یہاں بھی محسوس ہو رہی ہے

یا پھر دوسرے مجموعۂ کلام 'زخموں کے گلاب' کے یہ شعر ؎

تم اپنے ہاتھ ذرا سوچ کر بڑھا دینا ۔ بہت سے ہاتھ کٹے ہیں دراز دستی میں
برگِ آوارہ کی مانند ہے تنہا تنہا ۔ زندگی ساتھ مرا چھوڑ کے پچھتائی ہے
نہ جانے کب سے وہ ٹھہری ہے آکے ہونٹوں پہ ۔ وہ ایک بات جو اب تک بھی ناشنیدہ ہے
بڑے خلوص سے ہم آگئے تھے مے خانہ ۔ مگر یہاں بھی وہی مصلحت شناسی ہے
یہ سمجھ کر کہ کوئی راہ میں بیٹھا ہوگا ۔ ایک ہی رہ سے گذرتا ہوں ہمیشہ کی طرح
پھرتے تھے کل جو شہر میں قاتل بنے ہوئے ۔ بیٹھے ہیں آج صاحبِ محفل بنے ہوئے
زمانہ زندگی کا زہر دے کر ۔ پتہ مجھ سے اجل کا پوچھتا ہے
اجل سے زندگی کے راستے تک ۔ محبت درمیانی فاصلہ ہے

اور اب 'صنم تراشی' کے یہ شعر ملاحظہ کیجئے...

یہ پتھر کہاں سے آگئے لوگوں کے ہاتھ میں - موسم بہار کا تو بہت سازگار تھا
جب قتل کا الزام کسی اور کے سر ہے - پھر کس لئے اس لاش سے تم دور کھڑے ہو
جو سر کو جھکائے ہوئے پھرتا ہے یہاں پر - وہ شخص ہی کیوں قابلِ گردن زدنی ہے
اِن تازہ اُجالوں کی ہو تقسیم برابر - اِس دن کے لئے میں بھی اندھیروں میں رہا ہوں
پھولوں کے جسم سے بھی اُترنے لگا لباس — شاید یہ جشنِ گُل کا نیا اہتمام ہے
بہت سے نام تو کتبوں کی بن گئے زینت — میں کس کا نام لکھوں راستے کے پتھر پر
کیا بے بسی ہے سایۂ دیوار بھی نہیں — ہم لوگ ایک عمر سے ایسے گھروں میں ہیں
یارب! دیارِ غیر میں آوارہ گر پھروں — مٹی مرے وطن کی مرے ہاتھ میں رہے

اِس انتہائی بخیلی انتخاب سے بھی قارئین کو یہ اندازہ تو ہو جائے گا کہ نیّر کی شاعری میں تجربے بھلے نہ ہوں لیکن فن سے گہری وابستگی ہے۔ شعر آپ کے دل میں اُتر جاتا ہے اور پھر دل کے اس نہاں خانے میں ان آسودہ آرزوؤں اور ممکن الحصول کی خواہشوں کو کریدنے لگتا ہے۔ --

(پیش لفظ - صنم تراش - ۸ر دسمبر ۱۹۷۷ء)

○

○ صلاح الدین نیّر کے اب تک پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "گلِ تازہ" پہلا مجموعہ تھا، پھر "زخموں کے گلاب" کھلے، اس کے بعد "صنم تراش" نے جنم لیا۔ پھر "شکن در شکن" اور اب "خوشبو کا سفر" لیکن ان سب کا جذباتی مرکز

دیا ہے جو اس کا اپنا ہے۔ یہی تو ترقی پسندی کی پرچھائیاں ہیں۔
نسیمؔ نے شعر کہنے کے انداز میں کوئی نیا تجربہ نہیں کیا لیکن اس کے شعروں کے
مفہوم میں جو نئی پرتیں پیدا ہو گئی ہیں وہ ترقی پسند رجحانات کی دین ہیں جو
نسیمؔ کا اثاثہ بن گئی ہے۔

"گُلِ تازہ" کے یہ شعر تو آپ کو یاد ہی ہوں گے ؎

مے خانہ کی تہذیب پہ یہ سخت گھڑی ہے ۔ رندوں میں یہ کیوں آخر شب پھوٹ پڑی ہے
نہ جانے بزم سے کس کو اٹھا دیا تم نے ۔ تمام شہرِ وفا آج خالی خالی ہے
پلکوں میں چھپا لوں گا امڈتے ہوئے آنسو ۔ لیکن ترے دامن کو میں آواز نہ دوں گا
میں زندگی سے بچ کر آیا تھا میکدے میں ۔ اسکی کمی یہاں بھی محسوس ہو رہی ہے

یا پھر دوسرے مجموعۂ کلام 'زخموں کے گلاب' کے یہ شعر ؎

تم اپنے ہاتھ ذرا سوچ کر بڑھا دینا ۔ بہت سے ہاتھ کٹے ہیں دراز دستی میں
برگِ آوارہ کی مانند ہے تنہا تنہا ۔ زندگی ساتھ مرا چھوڑ کے پچھتائی ہے
نہ جانے کب سے وہ ٹھہری ہے آکے ہونٹوں پہ ۔ وہ ایک بات جو اب تک بھی ناشنیدہ ہے
بڑے خلوص سے ہم آگئے تھے مے خانہ ۔ مگر یہاں بھی وہی مصلحت شناسی ہے
یہ سمجھ کر کہ کوئی راہ میں بیٹھا ہوگا ۔ ایک ہی رہ سے گذرتا ہوں ہمیشہ کی طرح
پھرتے تھے کل جو شہر میں قاتل بنے ہوئے ۔ بیٹھے ہیں آج صاحبِ محفل بنے ہوئے
زمانہ زندگی کا زہر دے کر ۔ پتہ مجھ سے اجل کا پوچھتا ہے
اجل سے زندگی کے راستے تک ۔ محبت درمیانی فاصلہ ہے

اور اب 'صنم تراش' کے یہ شعر ملاحظہ کیجیے ؎

پتھر کہاں سے آ گئے لوگوں کے ہاتھ میں ۔ موسم بہار کا تو بہت سازگار تھا

جب قتل کا الزام کسی اور کے سر ہے ۔ پھر کس لئے اس لاش سے تم دور کھڑے ہو

جو سر کو جھکائے ہوئے پھرتا ہے یہاں پر ۔ وہ شخص ہی کیوں قابلِ گردن زدنی ہے

اِن تازہ اُجالوں کی ہو تقسیم برابر ۔ اِس دن کے لئے میں بھی اندھیروں میں رہا ہوں

پھولوں کے جسم سے بھی اُترنے لگا لباس شاید یہ جشنِ گُل کا نیا اہتمام ہے

بہت سے نام تو کتبوں کی بن گئے زینت میں کس کا نام لکھوں راستے کے پتھر پر

کیا بے بسی ہے سایۂ دیوار بھی نہیں ہم لوگ ایک عمر سے ایسے گھروں میں ہیں

یارب! دیارِ غیر میں آوارہ گر پھروں مٹی مرے وطن کی مرے ہاتھ میں رہے

اِس انتہائی بخیلی انتخاب سے بھی قارئین کو یہ اندازہ تو ہو جائے گا کہ نیّر کی شاعری میں تجربے بھلے نہ ہوں لیکن فن سے گہری وابستگی ہے۔ شعر آپ کے دل میں اُتر جاتا ہے اور پھر دل کے اس نہاں خانے میں ان آسودہ آرزوؤں اور ممکن الحصول کی خواہشوں کو کریدنے لگتا ہے۔ --

(پیش لفظ ۔ صنم تراش ۔ ۸ر دسمبر ۱۹۷۷ء)

○

○ صلاح الدین نیّر کے اب تک پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "گلِ تازہ" پہلا مجموعہ تھا، پھر "زخموں کے گلاب" کھلے، اس کے بعد "صنم تراش" نے جنم لیا۔ پھر "شکن در شکن" اور اب "خوشبو کا سفر" لیکن ان سب کا جذباتی مرکز

میری دانست میں وہی "گلِ تازہ" ہے جو ان پر چھایا ہوا ہے۔ وہ کہیں تھک کر بیٹھ بھی جاتے ہیں تو اُسی کی یاد اُن کے سر پر سایہ بن جاتی ہے اور تھکن اور تنہائی کی دھوپ سے اُنہیں بچاتی ہے۔ ؎

میں چلتے چلتے جہاں تھک کے بیٹھ جاتا ہوں　ترا خیال وہیں چھاؤں بن کے آئے گا

کتنے ہی پھول کھلے صحنِ چمن میں نیّر　پھر بھی اس بھیڑ میں تنہا تھا گلِ تر اپنا

اِس مجموعہ میں نیّر کی دو نعتیں، ۷۹ غزلیں اور ۱۰ نظمیں شامل ہیں۔ اپنے فنی نظریہ کے متعلق نیّر نے ابتداء ہی میں دو اہم باتیں کہی ہیں۔ "سخن میں روایت کا تسلسل ضروری ہے" اور "خوشبو کے سفر کی کوئی آخری منزل نہیں ہوتی" یہی وہ باتیں ان کے کلام کو سمجھنے کے لئے ضروری ہیں۔ اور شاید یہی اُن کے کلام کی حدیں متعین کرتی ہیں۔ وہ روایت کے تسلسل کے قائل ہیں لیکن روایت کا سفر کسی خطِ مستقیم اور مسطح زمین پر سفر تو ہے نہیں۔ جب روایت پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے تو اُسے توڑنے کی روایت بھی انسان ہی نے بنائی ہے۔ روایت کا تسلسل بغاوت کے امتزاج کے ساتھ ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہے۔ اور انسانی سماجی قدروں کے ساتھ روایت بھی ارتقاء کے زینے طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ ہر نئی روایت، پرانی روایت کا تسلسل بھی ہے اور اس سے الگ بھی۔ وہ نئی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے نو آفریدہ ہے۔ پھر خوشبو کے سفر کی کوئی آخری منزل نہیں ہوتی۔' خوشبو کو بہر حال جمالیاتی انسان کی دسترس میں ہونا چاہیئے۔

صلاح الدین نیّر شگفتہ لب و لہجہ کے شاعر ہیں اور ترنم کے ماہر

لکھنے بھی اچھا ہیں، پڑھتے بھی اچھا ہیں۔ اس لئے تعجب کیا ہو کہ جلوتیں وہ چھائے رہتے ہیں۔ سکریٹریٹ کی فائیلوں کی خشک و ریگ زار دنیا میں وہ غزل کا نخلستان بنائے ہوئے ہیں اور تھکے ماندے مسافر انہیں سستانے کے لئے آجاتے ہیں۔ خالص روایتی غزل کے ایسے شعر آپ کو اس مجموعہ میں خاصی تعداد میں مل جائیں گے ۔۔۔

وہ فرشِ گل سے بھی ہٹ کر کبھی چلا ہوگا　　کہ اُسکے پاؤں میں اک زخم کا نشان بھی تھا
اگرچہ ترکِ تعلق کو عمر بیت گئی　　مگر ہے آپ سے ملنے کی آرزو اب بھی

نیّر نے بہت اچھی نظمیں بھی کہی ہیں جو اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ ان میں سے "ماں سے محبت"، "بہن سے لگاؤ" جیسے پاکیزہ جذبات نظم کئے ہیں۔ لیکن لگتا ہے یہاں بھی غزل کی روایت ان پر مسلط رہی ہے۔ "روشنی کی شہزادی" کا یہ شعر خالص غزل کا شعر لگتا ہے۔

یہ کیسا رشتہ ہے تم دور بھی ہو، پاس بھی ہو
عجیب ربطِ مسلسل ہے تشنگی کی طرح

نیّر ایک حساس دل و دماغ رکھتے ہیں۔ عصری تقاضے کچھ ان پر اس طرح یلغار کرتے ہیں کہ وہ ان کے شعروں میں منعکس ہو ہی جاتے ہیں مگر غزل کی شان باقی رہتی ہے۔ ان اشعار کو کیا کہئے گا ۔۔۔

کھڑا ہوں اب میں جہاں سر پہ سائبان بھی تھا　　اسی محلہ میں میرا کبھی مکان بھی تھا
لکیر کھینچ کے ہم خود ہی ہو گئے محصور　　تمہارے شہر کا ورنہ حصار کتنا تھا
تشنگی عام ہے کس کس سے لڑو گے نیّر　　مئے کی تقسیم کہاں حسب روایات ہوئی

ان اوپنچے اونچے محلوں میں گھٹنے لگا تصادم ۔ آنگن کو پیار کرتے ہی تازہ ہوا ملی

یا پھر یہ اشعار ؎

احسان کہاں پھولوں پہ شبنم نے کیا ہے ۔ یہ جرم بھی اک دیدۂ پُرنم نے کیا ہے

صبحِ آزادی، اجالوں کی ضمانت تھی مگر ۔ اس ادا سے روشنی آئی کہ بینائی گئی

حالات اگر آپ کو لے آئیں مرے گھر ۔ کچھ مصلحت ایسی ہے شناسا نہ رہوں گا

آستانے سے ہٹا کر دربدر جس نے کیا ۔ ایسے دروازے کو اک دن کھٹکھٹانا ہے مجھے

کیوں اسی طرح سے وقت نے بھی فیصلے دیئے ۔ کس کو سزا ملی ہے؟ گنہگار کون تھا

ہم سے نہیں یہ سازشی ذہنوں سے پوچھیے ۔ قاتل اگر ہیں ہم تو سرِ دار کون تھا

اس مجموعے میں بعض ایسی غزلیں ہیں جہاں شہر حیدرآباد کے فسادات کی طرف اشارے ہیں، اور آپ کو یہ شعر ملیں گے ؎

اب بھی ہے جلتے مکانوں کا دھواں آنکھوں میں ۔ صبح کے نام پہ کچھ اور سیہ رات ہوئی

پھولوں سے گفتگو کا زمانہ گزر گیا ۔ خنجر زنی کا راج ہے شہرِ نجات میں

انصاف کیا کریں گے فقیہانِ شہر اب ۔ فرق آ گیا ہے جب نگہِ التفات میں

گھبرانا کیسا؟ شہرِ حوادث میں دوستو! ۔ سناٹا زندگی کا کبھی بولتا تو ہے

شہر کی تاریخ کہلاتے رہے جو کل تلک ۔ ایسے بھی کچھ لوگ نیّر آج بے گھر ہو گئے

کون کھینچے گا یہاں اب امن کی تازہ لکیر ۔ خون کے دھبّے ہی جب اپنا مقدر ہو گئے

نیّر نے اپنی فنی قسمت کے متعلق یوں لکھا ہے ؎

ہاتھوں کی لکیروں میں شاید یہی لکھا ہے

آئینہ صفت بن کر ٹکرانا ہے پتھر سے

خوشبو کا مسافر ہوں چلتا ہی رہوں گا میں
گو ٹوٹ کے بکھرا ہوں اک برگِ گُلِ تر سے

نیتّر کو ایک حقیقت بیان کرنی تھی۔ "گلِ تازہ" تو اس کا محبوب ہے جس کی خوشبو اُسے مصروفِ سفر رکھے ہوئے ہے لیکن سماجی حقیقتیں کچھ ایسی سنگین ہیں کہ وہ خود ٹوٹ کر بکھر گیا ہے۔

(خوشبو کا سفر۔ تبصرہ)
۱۹۸۳ء

○

ڈاکٹر حسینی شاہد

شکن در شکن

ایک زمانہ تھا کہ شاعر بڑی حسرت سے کہتا تھا۔

"میں غریب آدمی دیوان کہاں سے لاؤں"

لیکن آج حالات بدل چکے ہیں اور شاعر بڑے ٹھاٹ کے ساتھ ہر دوسرے تیسرے سال ایک نیا مجموعۂ کلام اپنے پڑھنے والوں اور پرستاروں کی خدمت میں بطورِ سوغات پیش کرتا ہے اور اس کا بڑی گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا جاتا ہے — صلاح الدین نیرؔ انہیں خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں۔ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۸ء تک ان کے تین مجموعے 'گلِ تازہ' 'زخموں کے گلاب' 'صنم تراش' چھپ چکے ہیں۔ شکن در شکن زیرِ طبع ہے۔ اِن کے علاوہ ان کی غزلوں کا تلگو ترجمہ "نیرؔ گیتا لو" بھی شائع ہو چکا ہے۔ توقع ہے کہ ان کے پچھلے تین مجموعوں کی طرح چوتھا مجموعۂ کلام بھی ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔

نیرؔ سے میرا رشتہ پرانا ہے لیکن یہ رشتہ شاعر اور قاری/سامع کا نہیں، اُستاد اور شاگرد کا ہے۔ میں کیسا اُستاد ثابت ہوا یہ تو نیرؔ بتا سکیں گے

لیکن میں نے انہیں ایک ذہین، شائستہ، صاحبِ ذوق اور سعادت مند شاگرد پایا۔ ۲۰، ۲۲ سال بیت گئے لیکن ان کی سعادت مندی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اُس وقت وہ ایک مبتدی تھے۔ مشقِ سخن کا ابھی ابھی آغاز ہوا تھا لیکن آج ان کا شمار حیدرآباد کے مقبول شاعروں میں ہوتا ہے۔ ادبی حلقوں میں انہوں نے اپنا مقام پیدا کرلیا ہے۔ عوام انہیں پسند کرتے ہیں اور شہر حیدرآباد ہی میں نہیں آندھراپردیش کے اضلاع میں بھی کوئی چھوٹا بڑا مشاعرہ ایسا نہیں ہوتا جہاں ان کی آواز کانوں میں رس نہیں گھولتی۔ آندھراپردیش کے باہر بھی انہوں نے کئی مشاعرے لوٹے ہیں۔ ہندوستان و پاکستان کے رسالوں میں ان کا کلام چھپتا ہے۔ یعنی ایک مبتدی سے مقبول اور مستند شاعر بن گئے ہیں لیکن اِس کے باوجود ان کی سعادت مندی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس سے ان کی وضعداری، شرافت اور شائستگی کا پتہ چلتا ہے۔ وضعداری، شرافت اور شائستگی، شخصیت اور فن دونوں کی تعمیر کے لئے ضروری ہیں۔ نیّر اس گُر سے خوب واقف ہیں۔

مشقِ سخن کے ساتھ چکّی کی مشقت حسرت کے حصے میں آئی تھی اور نیّر کو نوکرشاہی کے مشین کی گڑگڑاہٹ میں فکرِ سخن کا عذاب خود مول لینا پڑا۔ لیکن وہ خندہ پیشانی کے ساتھ یہ عذاب کئی سال سے جھیلتے آرہے ہیں۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان کی شعریت اور نغمگی اِس ناشاعرانہ اور ناسازگار ماحول کے باوجود اُبھرتی، نکھرتی اور سنورتی جارہی ہے۔ اور لال قلعے کا یہ قیدی حیدرآباد کے خوش گو، خوش فکر، خوش گلو شعراء میں ممتاز ہوتا

جارہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ خلوت در انجمن کا رمز ان پر منکشف ہو چکا ہے اور یا ہمہ دیلے ہمہ کے اسرار ان پر کھل چکے ہیں۔ یہ ایک عطیۂ الٰہی ہے جو صرف صوفی اور فن کار کو عطا ہوتا ہے۔

وہ دن بھر سکریٹریٹ میں فائل گردی میں مصروف رہتے ہیں۔ دفتر کے اوقات سے پہلے اور بعد جو وقت مل جاتا ہے وہ ادبی ٹرسٹ کے کاروبار میں گذر جاتا ہے۔ رات کی ابتدائی ساعتیں مدینہ ہوٹل کے ایک گوشے میں دوست احباب کے ساتھ خوش گپیوں میں بیت جاتی ہیں۔ چھٹیاں مشاعروں کے اہتمام اور اُردو مجلس کے ماہانہ اجلاس کی تیاریوں کی نذر ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جب مشاعرے میں آتے ہیں تو تازہ غزل ان کے جیب میں ہوتی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ شعر کہنے کے لئے کب وقت نکال لیتے ہیں۔ پھر وہ کم گو نہیں پُر گو ہیں۔

نیّرؔ غزل کے شاعر ہیں۔ ویسے اُنھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ آزاد اور پابند دونوں ڈھنگ کی نظمیں کہنے پر وہ قادر ہیں۔ ان کے ہاں مختلف موضوعات اور مسائل پر نظمیں ملتی ہیں لیکن ان کی وہی نظمیں کامیاب ہیں جن کا رنگ و آہنگ رومانی ہے۔ انہوں نے نعتیں اور منقبتیں بھی کہی ہیں اور اچھی کہی ہیں۔ احساس اور جذبۂ عقیدت میں ڈوب کر ایک عالم سرشاری میں لکھی ہے۔

نیّرؔ نے بھی دوسرے غزل گو شعراء کی طرح اپنی شاعری کا آغاز روایاتی مضامین سے کیا لیکن جب اُنہیں شعر گوئی کا سلیقہ آگیا تو آپ بیتی سنانے لگے۔

اپنے تجربات و مشاہدات اور اپنی واردات و کیفیات کو غزل کے سانچوں میں ڈھالنے لگے۔ یہیں سے ان کی انفرادیت کا اظہار ہونے لگا اور ان کا لب و لہجہ پہچانا جانے لگا، ان مرحلوں سے ہر ایک شاعر گذرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو پالیتا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ نیر نے اپنے آپ کو پالیا۔ یہ بڑا طویل اور پیچیدہ عمل ہوتا ہے اور اس سے گذرنے کے لئے تو ایک ... درکار ہوتی ہے۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ وہ اس راہِ عمل پر چل پڑے ہیں اور ان کی شاعری میں کیفیاتی تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ یہ بڑی خوش آئند علامت ہے۔

"گلِ تازہ" سے "صنم تراش" تک اپنے ہر مجموعے کو نیر نے "گلِ تازہ" کے نام معنون کیا ہے۔ اس لئے کہ خود اُن کے قول کے مطابق وہ ان کا سرمایہ شاعری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اپنی وضع داری کو برقرار رکھنے کے لئے وہ چوتھا مجموعہ بھی اسی کے نام معنون کریں۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں رہی۔ "گلِ تازہ" اب اپنا علاحدہ کوئی وجود نہیں رکھتا۔ وہ ایک علامت بن گیا ہے۔ پاکیزگیٔ عشق کا، طہارتِ نفس کا، لب و رخسار کا، رسن و دار کا، نشاطِ غم کا، دلبری و دل داری کا، تشنگی و ناآسودگی کا، دل سوزی و جگر کاوی کا، انسان دوستی اور انسان پرستی کا، ایک روشنی پسند بہار آفریں مستقبل کا۔ جن سے نیر کا نگار خانۂ شعر جگمگا رہا ہے۔

(شکن در شکن)

(پیش لفظ ــ ۱۰ر اگست ۱۹۷۹ء)

ڈاکٹر سی۔ نارائن ریڈی

وائس چانسلر اوپن یونیورسٹی آندھرا پردیش

"سفر جاری ہے"

(رسم اجرا انجام دیتے ہوئے)

ادارۂ شعر و حکمت کی جانب سے جناب صلاح الدین نیّر کے ساتویں مجموعۂ کلام "سفر جاری ہے" کی رسم اجراء کے لئے آپ نے مجھے جو عزت بخشی اور چند کلمات کہنے کا جو موقع دیا ہے، میں اس کے لئے شکر گذار ہوں۔

ہر انسان، زندگی کے سفر میں ایک مسافر ہے، اس کا ہر مقصد ایک منزل ہے بعض ایک منزل تک پہنچنے کے بعد تھک کر رک جاتے ہیں بعض اس منزل سے بھی آگے اپنا سفر جاری رکھتے ہیں کیونکہ انہیں ایک نئی منزل کی تلاش ہے۔ اس طبقے سے تعلق رکھنے والے شعراء ہمیشہ مسافر ہی رہتے ہیں یعنی کہ وہ ان تھک مسافر ہے۔ اگر کوئی شاعر یہ سمجھتا ہے کہ اسے اپنی منزل مل گئی اور اس پر فخر کرتا ہو تو اس کی یہ کامیابی کی دلیل نہیں بلکہ تنگ نظری کی دلیل ہے۔ صلاح الدین نیّر کا تعلق اسی طبقے سے ہے جو ہمیشہ سفر جاری رکھتے ہیں، اسی لئے انہوں نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام "سفر جاری ہے" رکھا ہے۔ ہاں! اس لئے میں کہتا ہوں کہ شاعری کا کارواں کبھی رکتا نہیں،

نہ ہی شاعر کو ماضی کے نقوش کو دیکھ کر خوش ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہ مستقبل کو شاعری کی کسوٹی پر پرکھ سکے۔

غزل ہو یا نظم، نیّر کی شاعری ان کی دل کی زبان ہے۔ نیّر ردیف اور قافیہ کی بندشوں تک محدود نہیں ہوتے بلکہ اپنی غزلوں میں موجودہ زمانے کے مسائل اور زندگی کے واقعات کو بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں جو ہماری دل کی گہرائیوں کو چھو لیتی ہیں۔

نیّر کہتے ہیں "میں نے وہی کیا ہے جو میں نے محسوس کیا ہے"۔ یہ بات سننے میں بہت آسان معلوم ہوتی ہے جیسے ہوا اور روشنی، لیکن کسی نے پوچھا کہ ہوا کیا ہے تو ہم ایک لمحہ کیلئے رک جاتے ہیں۔ شاعری بھی ایسی چیز ہے۔ احساس کو شعر میں بدل دینا آسان کام نہیں ہے۔ نیّر نے اس کام کو نہایت خوبی سے انجام دیا ہے۔

اِس مجموعۂ کلام میں نیّر نے زندگی کی اُن حقیقتوں کو لفظوں کا جامہ پہنایا ہے جن میں رشتوں کی مہک بھی ہے، احساسِ تنہائی کی جھلک بھی۔ موجودہ واقعات کے تجربوں کی تلخی بھی اور بیتے ہوئے لمحات کی مٹھاس بھی شامل ہے۔

آج ہم ہر جگہ ظلم و ستم کی واردات کی خبریں سنتے ہیں۔ نیّر صاحب نے ہندوستان کے موجودہ حالات کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہا ہے ؎

کیا شہر تھا کس طرح سے برباد ہوا ہے
قاتل کے سوا شہر میں اب کون بچا ہے

نیّر کبھی کبھی آنے والے کل کا ایک دُھندلا سا عکس بھی پیش کرتے ہیں

اُن کا یہ شعر غور طلب ہے ؎

مصلحت کو چھوڑ دیئے گھر کی حفاظت کیجئے
چھت گری ہے آج تو دیواریں کل گر جائیں گی

نیّر کبھی تھکتے نہیں ہیں وہ نئی منزل کے لئے ایک نئی پرواز کا پیغام دیتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

ایک پل رُکنے نہ پاؤں گا میں دورانِ سفر
میں تو اک شاہین ہوں میرا نشیمن اور ہے

نیّر کبھی درد میں ڈوبی ہوئی بات بھی کہتے ہیں تو کبھی دلوں کے ریشمی اوراق کو بھی بھگوتے ہیں ؎

نیّر! شگفتہ یادوں کی جب لہر آ گئی
ہر زخم مسکراتا ہوا پھول ہو گیا

میں اپنے دوست جناب صلاح الدین نیّر کو اپنے ساتویں مجموعۂ کلام کے لئے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ نیّر کا یہ سفر رشتوں کی مہک لئے ہوئے پُرانی یادوں کو سینے میں دفن کرتے ہوئے ہمیشہ جاری رہے گا۔

(۱۹۸۸ء)

◯

ڈاکٹر سیّدہ جعفر

"گُلِ تازہ" کا شاعر ـ صنم تراش

غزل کی بے پناہ موہنی ہر دور میں ہر درجہ کے شاعروں کو مسحور کرتی رہی ہے۔ اُس دور میں بھی جب مقصدیت، افادیت اور سماجی حقیقت نگاری کے اظہار میں غیر متوازن اور غیر معتدل رویہ اختیار کیا گیا تھا، غزل کی مقبولیت پر آنچ نہ آنے پائی تھی۔ اُس کے اشاروں اور اُس کی علامتوں میں جو وسعت، ہمہ گیری، اثر انگیزی اور لچک ہے اُس نے ہر وقت غزل کی آبرو رکھ لی ہے یا وہ ساغر کے پردے میں شاہدِ حق کی گفتگو سے لے کر "دار" اور "صلیب" کی رعایت تک غزل کی علامتیں اور کنائے ہمارے ذہنوں کی رہبری کرتے رہے ہیں۔

موجودہ دور کے نوجوان شاعروں نے بھی غزل کے موضوع کی بُوقلمونی، اُس کے حسین پیکر کی صد جلوہ گری سے فیض اُٹھایا ہے کیونکہ اب اس صنف میں لب و رخسار کی حکایتوں اور دل پُرخوں کی گلابی کے ساتھ ساتھ وقت کی دھڑکنوں کا رنگ بھی شامل ہوتا ہے۔ غزل کی یہی ہمہ گیری، حیدرآباد کے نوجوان شاعر صلاح الدین نیّر کی آرزو کا مرکز ہوگی۔

صلاح الدین نیّر کو حیدرآباد کے نوجوان شعراء میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ وہ نظم نگار اور غزل گو دونوں حیثیتوں سے مقبول ہیں اور اس مقبولیت میں ان کی خوش گوئی اور خوش گلوئی دونوں کا حصہ ہے۔

نیّر کی غزلوں کا زیر نظر مجموعہ "گلِ تازہ" بہت سے اعتبارات سے اس قابل ہے کہ اس کو شوق سے پڑھا جائے۔ نیّر کی غزلیں ہلکی پھلکی، سیدھی سادی اور شگفتہ اور رسیلی ہیں۔ ان میں زندگی اور محبت کے بہت سے تجربوں کا نچوڑ ہے۔ حیات کے تپتے ہوئے لمحات کا [illegible] بھی ہے اور حسین یادوں کی مستی بھی، کاکل رخسار کی تابناکی بھی اور شعور زیست کا وقار بھی۔ نیّر کے شعر شائد اس لئے بھی ہماری توجہ اسیر کر لیتے ہیں کہ زندگی کی جن حقیقتوں کو انھوں نے شعر کا جامہ پہنایا ہے وہ جگ بیتی اور سنی سنائی باتیں نہیں، واردات قلب ہیں اور انہیں بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا گیا ہے اور اس خصوصیت نے صلاح الدین نیّر کے تغزل میں خلوص کے ساتھ ساتھ اثر آفرینی بھی پیدا کر دی ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کے اندازِ نظر کو حقیقت پسندانہ بنا دیا ہے۔

نیّر کی غزلوں میں فلسفہ کی پیچیدہ بحثیں نہیں۔ تصوف کی اونچی اڑانیں نہیں۔ صنائع و بدائع سے نگاہوں کو خیرہ کر دینے کی لو نہیں۔ بندش اور ترکیب کی صاعقہ پاشی نہیں۔ فن کا احترام ہے۔ زندگی سے پیار کرنے کا سلیقہ ہے۔ عشق کے معرکے سر کرنے کا عزم ہے۔ حیات کی پُر پیچ راہوں سے سر کے بل گذر جانے کا حوصلہ ہے۔ چاہنے اور چاہے جانے

کی مچلتی ہوئی تمنائیں ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فن کار ماحول کا زہر پی کر زندگی کے جام کو امرت کی بوندوں سے بھر دیتا ہے۔ وہ آگ میں جل کر پھول برساتا ہے اور اپنے سینے کا گداز پڑھنے والوں کی نذر کر دیتا ہے۔

جو گرمیٔ احساس سے تپتا رہا نیرؔ
فن کار وہ ہر دور میں مقبول رہا ہے

نیرؔ کی غزل گوئی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے اکثر جگہ زندگی، محبت کے بظاہر چھوٹے لیکن دل و دماغ پر ایک گہرا رنگ چھوڑ جانے والے تجربات کی عکاسی کی ہے۔ یہ معمولی باتیں یہ ہلکے پھلکے تجرباتِ محبت بعض وقت زندگی کو ایک نئے موڑ سے آشنا کر دیتے ہیں اور شاعر قیمتِ غم کے لئے عشرتِ عمر ابد کی بازی لگا دیتا ہے۔

نیرؔ عامتہ الورود تجربات کو عام انسان کے نقطۂ نظر سے دیکھنے اور ان میں جذبات اور احساس کی جو دنیا چھپی ہوئی ہے اسکو شعر کے پیکر میں سمو دینے کے عادی ہیں۔ یہ محبت کا کوئی انوکھا تجربہ نہیں لیکن نیرؔ نے جس پُر اثر انداز میں اس واقعہ کو دو شعروں میں سمو دیا ہے اس میں ایک تازگی اور اثر انگیزی ضروری ہے۔ ؎

جب تمہارے خط کو میں نے نذرِ آتش کر دیا ایک ایک لفظِ وفا نے دور تک پیچھا کیا
آخری تحریر تھی اُن کی یہ میں نے کیا کیا خود بھی تنہا ہو گیا اُن کو بھی تنہا کر گیا

جانے بوجھے اور عامتہ الورود تجربات کو اس سلیقے کے ساتھ پیش کہ سننے والے کو اس میں اپنے دل کے دھڑکنے کی صدا آئے۔ غزل گو

کے فن میں جو خصوصیت ہے وہ ایسی نہیں ہے جس کو بہ آسانی نظر انداز کیا جا سکے۔
غزل کا کمال مرعوب کرنا نہیں، دل کو جیت لینا ہے۔

نیّر سریع الفہم انداز میں روزمرہ زندگی کے ایسے تجربات کو جن میں گرمیِ حیات، احساس کی چبھن، ماحول کا شعور اور مذاقِ عشق ہے۔ بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں عشق، کہیں پندارِ حسن کا داعی ہے تو کہیں حسن کی رہگذر میں سجدہ ریز۔ محبت کی کامرانی کا ایقان اور عشق کی لامحدود مفتوحات اور ہمہ گیر تغیر کے یقینِ محکم نے صلاح الدین نیّر کی غزلوں میں رجائیت کی لہریں دوڑا دی ہیں۔

تمہیں بھی بجھیں دل بھی بجھا آس نہ ٹوٹی ۔ آ ناترا اے دوست بہرحال اٹل ہے
قدم تمہارے اندھیروں نے جب بھی روک دیئے ۔ تو ہم نے راہ میں جگنو اڑا دیئے کہ نہیں

نیّر کی ذات میں جو شرافت، سنجیدگی اور شائستگی ہے اس کا پرتو ان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ ان کی محبت میں بڑی متانت اور خودداری ہے۔ جذبۂ ایثار اور صدق و خلوص ہے۔ انہیں شہر نگاراں میں ایک اجنبی کے لٹ جانے کا غم نہیں حسن کی رسوائی کا ڈر ہے۔ پاسِ ناموسِ عشق کا یہ انداز ملاحظہ ہو ؎

یہی اک مصلحت تھی ہونٹ اپنے سی لئے میں نے ۔ مری رسوائیوں کے ساتھ تیرا نام آتا ہے
آپ دامن نہ بڑھائیں مرے اشکوں کے لئے ۔ میرے اشکوں سے کہیں آپ کا دامن نہ جلے
گھبراؤ نہیں پیار کو رسوا نہ کروں گا ۔ تم پاس سے گذرو گے تو آواز نہ دوں گا

صلاح الدین نیّر نے کہیں بھی نعرہ بازی سے کام نہیں لیا ہے لیکن

سماجی زندگی کے انتشار اور اس کی گھٹن کو انہوں نے بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ فن کار گرد و پیش کے حالات سے بیگانہ اور بے تعلق نہیں رہ سکتا۔ سماجی زندگی کے تجربات کا ردعمل، شعوری اور غیر شعوری طور پر اس کے فن میں نفوذ کر جاتا ہے۔ شاعر جس فضا میں سانس لیتا ہے اس کی عفونت اور خوشبو دونوں کا احساس اُس کی شاعری میں رچ جاتا ہے۔

سرحد سرحد خون ہے ارزاں　　شہر میں لیکن جشنِ چراغاں
تم سے اے زندگی کے دیوانو　　آبرو بڑھ گئی صلیبوں کی
او بچے محلوں کی روشنی کیلئے　　اجنبی شہر میں غریب جلے

کسی بدمست کو ساغر پہ ساغر ملتے جاتے ہیں
کسی پیاسے کے ہاتھوں میں شکستہ جام ہوتا ہے

نیر کی غزلوں کا مجموعی آہنگ نشاطیہ ہے۔ کیونکہ وہ زخموں کی نمائش نہیں کرتے۔ تلخیٔ زیست چکھ کر مسکرا دیتے ہیں اور انہیں یقین ہے کہ ہر حال میں صدق و خلوص کی فتح ہوگی اور انسانیت کا بول بالا رہے گا۔

صلاح الدین نیر کی طرزِ ادا میں خاص رنگینی، لطافت، رچاؤ، ستھراپن اور شادابی ہے جو ان کی غزلوں میں ایک مخصوص تازگی اور انفرادیت کا احساس پیدا کر دیتی ہے۔ سادگی اور روانی نے انفرادیت کے رنگ کو اور چوکھا کر دیا ہے۔

یادوں کے کتنے رنگ محل پچھلی رات میں　　پلکوں پہ میری نیلم و یاقوت جڑ گئے
جب کبھی دل میں خیالاتِ حسیں آتے ہیں　　کتنے بھولے ہوئے غم دل کے قریں آتے ہیں
محفلِ دل میں ذرا جشنِ چراغاں کرلوں　　درد و غم ساتھ لئے دل کے مکیں آتے ہیں

جن کو چاہا دل سے انکو شکوۂ بیداد ہے ۔ سوچتا ہوں وقت بھی کتنا ستم ایجاد ہے
کم کیجئے نہ قیمتِ غم میرے واسطے ۔ یہ میں نے کب کہا ہے کہ سب سے بلند ہوں
وہ چراغ گل شب کو بجھ گیا سرِ محفل ۔ جس کو ڈھونڈتے ہو تم آج کے اُجالوں میں
عقل کی فتح پہ ہنستی ہے مرے دل کی شکست آپ کی جیت کو میں مات کہوں یا نہ کہوں

۔۲۰

یہ سیدھے سادے پُراثر، رقصاں، خنداں، رسیلے، سُبک اور ترنم ریز اشعار ایسے نہیں کہ آپ آسانی سے انہیں نظر انداز کر سکیں۔ آج صلاح الدین نیّر حیدرآباد کے شاعروں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں ہندوستان کے بہترین شعراء میں ان کا شمار ہو گا۔

("گلِ تازہ" کی رسمِ اجراء کے دن روزنامہ سیاست
میں شائع ہوا)

(۲۹ اگست ۱۹۶۵ء)

○

○

○ "صنم تراش" صلاح الدین نیّر کا تیسرا مجموعہ کلام ہے جس میں بہت سی نئی اور کچھ پرانی غزلیں نئی آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں۔ گلِ تازہ اور زخموں کے گلاب سے لے کر صنم تراش تک نیّر کا فن بڑی سرعت کے ساتھ ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

صلاح الدین نیّر نے ابلاغ و ترسیل کا ایک منفرد پیرایہ اپنایا ہے جس کا احساس ان کے پہلے مجموعہ کلام "گلِ تازہ" میں موجود ہے۔ حیدرآباد کے ان شاعروں میں جنھوں نے گزشتہ دو دہائیوں میں شاعری کی دنیا میں اپنے شخصی لب و لہجہ کی وجہ سے ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے۔ نیّر کا نام بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے۔ میں نے "گلِ تازہ" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اُن کی ذات میں جو شرافت، سنجیدگی اور شائستگی ہے اس کا پرتو ان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صنم تراش میں نیّر کی شخصیت پوری طرح بے نقاب ہو گئی ہے۔

صلاح الدین نیّر کی بعض غزلیں ایک ہی جذباتی رویے، ایک ہی سوز اور ایک ہی محسوساتی ردعمل کا آئینہ ہیں۔ ان کی مسلسل غزلوں کا رومانی اور جمالیاتی پس منظر انھیں ایک پُرسوز کیفیت سے آشنا کرتا ہے۔

صلاح الدین نیّر کی غزل گوئی کے دو بنیادی عناصر ہیں۔ وارداتِ عشق کی بوقلمونی اور جہدِ حیات کا کرب ان کے اشعار میں شعورِ زیست اور عصری حسیت کی

فراوانی بھی ہے۔ اور محبت کے لطیف جذبات کی رنگا رنگی اور تنوع بھی اور یہ دونوں عناصر ان کے کلام میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ہم آمیز ہو گئے ہیں۔ یہ فکر کے اضطراب اور جذبے کی جادو کا سنجوگ ہے۔ نیر کی شاعری میں شعورِ سلاسل اور پائل کی صدا ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔

نیر نے موضوعاتی نظمیں بھی کہی ہیں۔"گاندھی ازم" "کون قاتل ہے" "ماں کے آنسو" اور "وہ ایک لمحہ" ہنگامی اور موضوعات پر معروضی انداز میں فنطائیت کی سطح سے کہی ہوئی موقتی طور پر متاثر کرنے والی نظمیں نہیں ہیں بلکہ ان میں خیال آفرینی اور انسانیت کے مسلک سے وابستگی کا احساس بھی ہے۔ یہ موقتی تحریک کے تحت کہی ہوئی بیانیہ طرز کی نظمیں نہیں بلکہ ان میں تفکر و تعمق کی جھلک موجود ہے لیکن بنیادی طور پر صلاح الدین نیر غزل کے شاعر ہیں۔
صنم تراش کی غزلوں کا سلسلہ بتاتا ہے کہ اب غزل کے فن پر شاعری کی گرفت مضبوط ہو چکی ہے۔ ابتدائی غزلوں میں محبت ایک والہانہ کیفیت اور از خود رفتگی کی علامت بن کر ہمارے سامنے آتی ہے لیکن "صنم تراش" کے اشعار میں گمبھیر تاثرات، سنجیدگی اور جذبات کے توازن کا احساس ملتا ہے۔

غزل کی روایتی مضامین میں انھوں نے شخصی واردات اور انفرادی تجربے کی چاشنی پیدا کی ہے۔ تعمیم کی اسی صلاحیت نے غزل کو ہر دور میں مقبول صنف بنادیا ہے۔ اور اُسے انسانی تجربے کی ایک ابدی کسک عطا کی ہے۔ نیر کے اشعار کا خاص وصف تجربے اور اس کی انفرادیت، سوز و ساز، دردمندی، گھلاوٹ اور پُروقار متانت ہے۔ نیر کے چند شعر جو ان کے مخصوص طرزِ ادا کی ترجمانی کرتے

ہیں، ملاحظہ ہوں ؎

آپ کے شہر میں ہم خانہ بدوشوں کیلئے ۔ کوئی تو ہوگا جو جینے کی دعا مانگے ہے

برگِ آوارہ کی مانند ہے تنہا تنہا ۔ زندگی ساتھ مرا چھوڑ کے پچھتائی ہے

ماضی کی پگھلتی ہوئی دہلیز پہ آکر ۔ یہ کون ہے جو دیر سے خاموش کھڑا ہے

اے دوست کئی بار یہاں ٹوٹ چکا ہوں ۔ تب جا کے ترے شہر میں آئینہ بنا ہوں

عجیب بات ہے دورِ جدید کا انسان ۔ نہ دوستی کے لئے ہے نہ دشمنی کے لئے

میں بھول چکا ہوں تمہیں یہ مجھ سے گلہ ہے ۔ تم نے بھی تو حالات سے سمجھوتہ کیا ہے

"صنم تراش" میں شاعر کا طرزِ ادا اس لئے زیادہ موثر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ابلاغ کے لئے رعائیت کا حربہ استعمال کیا ہے۔ اس تیسرے مجموعے میں شاعر نے غزل کے مروجہ علائم کو نئے انداز میں نئی معنوی وسعتوں کے ساتھ برتنے کی کوشش کی ہے۔ نئیر کی جدید غزلوں میں تہہ داری بھی ہے اور نئی جہت کا احساس بھی جاری وساری نظر آتا ہے۔ نئیر کے ایسے اشعار بھی ہیں جن میں سماجی پس منظر کی طرف بلیغ اشارے کئے گئے ہیں۔ غزل کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہوکر نئے مفاہیم کے ترجمان بن گئے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مے خانے کی تہذیب پہ یہ سخت گھڑی ہے ۔ رندوں میں یہ کیوں آخرِ شب پھوٹ پڑی ہے

خوشبوئے بہاراں درِ زنداں پہ کھڑی ہے ۔ میں ہوں کہ مرے پاؤں میں زنجیر پڑی ہے

ہمیں سے روشنی ہے میکدے کی راہوں میں ۔ ہمیں نے شمعیں جلائی ہیں قتل گاہوں میں

کیا ضروری ہے کہ شعلوں کو ہوا دی جائے ۔ کیوں نہ اس شہر سے یہ رسم اٹھا دی جائے

کچھ لوگ ابھی قتل کی سازش میں ہیں مصروف   حالانکہ مرا نام شہیدوں میں لکھا ہے

نیّر کا طرز ادا جدید علائم اور نئے لب و لہجہ سے اثر پذیری کا بھی غماز ہے۔ ان کی امیجری اور اشاریت و کنایات میں زبان کے نئے امکانات کا احساس موجود ہے۔ نئی نئی تشبیہات اور استعارے نیّر کے اشعار میں اکثر جگہ ایک نئی معنویت کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ غزل کے روایتی کردار اور اس کی مخصوص لفظیات سے وابستگی کے باوجود صلاح الدین نیّر کے لب و لہجہ میں ایک خوشگوار تازگی اور جدت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

اپنی کھوئی ہوئی آواز کے پیچھے پیچھے ۔ ایک مدت سے میں چلتا ہوں ہمیشہ کی طرح

اب بھی مل جاتے ہیں کچھ چہرہ ماضی کے نقوش۔ راستے میں کسی ٹوٹے ہوئے درپن کی طرح

اتنے لگے ہیں زخم کہ دل بولتا نہیں ۔ آئینہ اپنا بھید کبھی کھولتا نہیں

مجھے اُمید ہے کہ ادبی حلقوں میں "صنم تراش" کی اچھی پذیرائی ہوگی کیونکہ یہ مجموعہ شعری ادب میں ایک پسندیدہ اضافہ ہے۔

--

("صنم تراش"   ۷ / مئی ۱۹۷۹ء)

ڈاکٹر مغنی تبسم

صنم تراش - خوشبو کا سفر

گذشتہ ۱۷، ۱۸ سال میں حیدر آباد کی سرزمین سے اُردو کے جو نوجوان شاعر اُبھرے ان میں صلاح الدین نیّر ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ان کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ بیرونِ ریاست کے بھی اکثر کُل ہند مشاعروں میں شرکت کرتے رہتے ہیں۔ نیّر کی مقبولیت اور شہرت مشاعروں ہی کی حد تک محدود نہیں بلکہ ہندوستان اور پاکستان کے ادبی جرائد میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔

صلاح الدین نیّر کو میں گذشتہ ۱۶، ۱۷ برس سے پڑھتا اور سنتا رہا ہوں۔ خلوص کے ساتھ شعر کہتے ہیں۔ مسلسل مشق و ممارست سے اب ان کے اسلوب میں ایک انفرادیت پیدا ہو چلی ہے۔ ان کے لہجے میں ایک طرح کی تازگی اور حلاوت کا احساس ہوتا ہے۔ نیّر کو غزل سے طبعی مناسبت ہے۔ غزل کہنا یوں تو بہت آسان ہے لیکن غزل گوئی میں اپنے لئے الگ راہ نکالنا اتنا ہی دشوار ہے۔

نیّر قافیہ پیمائی کے اس دشوار راستے پر بڑی ثابت قدمی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں اور اب غزل گوئی کے فن پر ان کی گرفت مضبوط ہو چلی ہے۔

"گلِ تازہ" اور "زخموں کے گلاب" کی غزلوں کے مقابلے میں "صنم تراش" کی غزلوں
میں ایک نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے کہ اب وہ براہِ راست اظہار کے بجائے ایمائیت
سے کام لینے لگے ہیں۔ غزل کے روایتی مضامین سے دامن بچاتے ہیں۔ شخصی واردات
اور انفرادی احساسات کو حُسنِ تعمیم کے ساتھ پیش کرنے کا سلیقہ اُنہیں آگیا
ہے، جو کامیاب غزل گوئی کی ناگزیر شرط ہے۔ نیّر نے جہاں تقلید اور روایت پسندی
سے اپنی شاعری کو محفوظ رکھا وہیں وہ وقتی تحریک اور فیشن زدگی سے بھی ہمیشہ
دامن بچاتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا رنگِ سخن تمام قدیم اور ہم عصر شعراء
سے مختلف اور منفرد ہے۔ بہت سے جدید غزل گو شعراء کے برعکس اُن کی
شاعری ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ غزل کی صنف میں وہی شاعر پنپ سکتا
ہے جو روایت کی پاسداری کے ساتھ روایت سے انحراف کرے۔ کچھ منتخب
شعر پیش ہیں۔

روشنی گھر میں ہے جن کے اُنہیں آنکھیں نہ ملیں — کسی غریبی کا دکھاتی ہیں یہ منظر آنکھیں
جب قتل کا الزام کسی اور کے سر ہے — پھر کس لئے اِس لاش سے تم دُور کھڑے ہو
اندھیرے اِس قدر پھیلے ہوئے ہیں — میں اپنے آپ سے ٹکرا رہا ہوں
اعتمادِ رہ نوردی حد سے بڑھ جائے اگر — زندگی خود اپنے ہی آنگن میں ٹھوکر کھائیگی
پتھر کہاں سے آگئے لوگوں کے ہاتھ میں — موسم بہار کا تو بہت خوشگوار تھا

اِن اشعار میں غزل کی رسمی لفظیات، نئے لسانی روابط کے ساتھ معانی
کی نئی جہات کی حامل ہوگئی ہیں۔ نیّر نے ترقی پسندی کی روایت اور جدید تجربوں
کو ہم آمیز کرکے ایک ایسی زبان تشکیل دی ہے جو ان کے فکر و احساس کا ابلاغ

موثر اور بھرپور طریقے سے کر سکتی ہے۔ ان کے اکثر اشعار سیاسی مفہوم کے حامل ہونے کے ساتھ تعمیم کا ایسا وصف اپنے اندر رکھتے ہیں جو انہیں تہہ دار بنا دیتا ہے اور یہی استعارے دوسری طرف عمومی حیثیت کے آئینہ دار بن جاتے ہیں۔ نیّر کی شاعری کا یہی وہ انفرادی پہلو ہے جو ان کی غزل کو تازگی اور توانائی بخشتا ہے۔

نیّر نے نظم کی صنف کو بھی اپنے مخصوص انداز میں برتا ہے۔ ان کی نظموں میں بیانیہ اسلوب حاوی ہے۔ یہ نظمیں اس روایت سے قریب تر ہیں جسے ترقی پسند تحریک نے پروان چڑھایا تھا۔ مجموعی طور پر صلاح الدین نیّر کی شاعری میں تجربے اور احساس کی انفرادیت نمایاں ہے۔ نیّر کی شاعری گہری انسانیت دوستی کے ساتھ اس خاص کیفیت سے مملو ہے جسے میر نے دردمندی کا نام دیا تھا۔ ان کا کلام پڑھتے ہوئے کوئی شخص ان کے خلوصِ وفا اور جذبۂ عشق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(پیش لفظ۔ صنم تراش۔ ۳۰ ڈسمبر ۱۹۷۷ء)

○

○ صلاح الدین نیّر کی شاعری کے اب تک چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ برسوں سے ان کا کلام ادبی رسالوں میں شائع ہوتا ہے اور وہ کئی ریاستی اور کل ہند مشاعروں میں شریک ہو کر ہزاروں سامعین سے داد حاصل کر چکے ہیں۔ وہ ہندوستان اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں اچھی طرح جانے پہچانے جاتے ہیں اور جدید دور کے

شعرا میں اپنا مقام پیدا کر چکے ہیں۔ ان کی شاعری اب کسی رسمی تعارف کی محتاج نہیں رہی ہے۔

صلاح الدین نیّر قابلِ رشک حد تک پُر گو اور زود گو شاعر ہیں۔ غیر معمولی طور پر حساس ہونے کے ساتھ وہ گہری تخلیقی لگن بھی رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری، بالخصوص غزل گوئی کا اپنا ایک مزاج ہے۔ انہوں نے غزل کی روایتی مضامین اور اسالیبِ اظہار سے دامن بچاتے ہوئے اپنا ایک مخصوص اور منفرد طرز ایجاد کیا ہے۔ ان کے لہجے میں خاص طرح کی متانت، نرمی اور دل پذیری کی کیفیت محسوس ہوتی ہے جو انسانیت دوستی اور خلوصِ وفا سے عبارت ہے۔ اظہارِ عشق میں والہانہ سپردگی کے ساتھ احترامِ نفس کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔ غمِ فراق ہو کہ نشاطِ وصل ہر طرح کی کیفیات کو انھوں نے شائستگی اور وقار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ نیّر کی عشقیہ شاعری کا بڑا حصہ حزن و ملال کے احساسات سے مملو ہے۔ اِن اشعار میں ایسا سوز و گداز ہے جس کی آنچ میں دل پگھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

جس نے آہٹ بھی نہ چھوڑی اُسکو اب ڈھونڈوں کہاں
اپنی خوشبو تک وہ آنچل میں چھُپا کر لے گیا

پھول کھِلنے تک کسی کی انگلیاں زخمی رہیں
اپنے جوڑے کے لئے کوئی کلی تر لے گیا

خدا سے اپنے کبھی میں نہ مانگتا آنکھیں
تمہاری دید کو گر عمر بھر ترستا تھا

تجھ سے مل کر ایک دن جب وہ جدا ہو جائیگا
کون جانے شہر میں اُس روز کیا ہو جائیگا

میری پلکوں پر ٹھہر جائیں گے آنسو آپ کے
اور پھر آنکھوں سے اوجھل قافلہ ہو جائیگا

وہ فرشِ گل سے بھی ہٹ کر کبھی چلا ہوگا
کہ اُس کے پاؤں میں اک زخم کا نشان بھی تھا

صلاح الدین نیّر کی غزل صرف وارداتِ عشق کی ترجمان نہیں ہے۔ انہوں نے حیاتِ انسانی کے گوناگوں مسائل کے بارے میں اپنے افکار اور محسوسات کو بھی عمدگی کے ساتھ موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے دورِ حاضر میں اعلیٰ انسانی قدروں کی شکست و فنا کے مرثیے ہی نہیں لکھے بلکہ ان کو حیاتِ نو بخشنے کا عزم بھی ظاہر کیا ہے۔ علاوہ ازیں موقتی سیاسی اور سماجی مسائل کی ترجمانی بھی اس انداز سے کی ہے کہ کہیں بھی غزل کا مزاج بدلنے یا بگڑنے نہیں پایا ہے۔ اس نوع کے بیشتر کلام میں وجودیت پسندانہ طرزِ احساس جھلکتا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

قدم کسی کے اُٹھے ہوں بنامِ سیرِ چمن	نصیبِ سبزۂ گلشن تو پائمالی ہے
اک نسل میرے سامنے ہے کیا جواب دوں	اُجڑے ہوئے مکانوں کی تعمیر رہ گئی
سب چلے جائیں گے کل زخمی بدن رہ جائیگا	شہر میں اک شخص بے گور و کفن رہ جائے گا
بہت سے لوگ اندھیروں سے بچ کے آئے مگر	کسی کے چہرے پہ رنگِ سحر نہیں آیا

مندرجہ بالا اشعار نیّر کی شاعری کے ایک نئے اور تابندہ رُخ کو سامنے لاتے ہیں۔ ان میں غزل کی روایت کے احترام کے ساتھ انفرادی تجربہ اور احساس کا بھرپور اظہار اعلیٰ فنکاری کے ساتھ کیا گیا ہے۔ روایتی استعاروں کو نئے تلازمے دیئے گئے ہیں اور دُوررس رعائیت سے کام لیا گیا ہے۔

صلاح الدین نیّر کی شاعری کا یہ مجموعہ ان کے شعری سفر کا ایک سنگِ میل ہے منزل نہیں ہے۔ انھیں کے الفاظ میں یہ خوشبو کا سفر ہے جسکی کوئی آخری منزل نہیں ہوتی۔

(۲۵ دسمبر ۱۹۸۳ء)

یوسف ناظم

رشتوں کی مہک

صلاح الدین نیّر سے جب بھی ملتا ہوں، کہیں سنتا ہوں، کہیں پڑھتا ہوں تو محمد علی نیّر کی یاد آتی ہے۔ ایم۔ اے میں یہ میرے ہم جماعت تھے۔ ۱۹۴۲ء سے ۴۴ء تک مجلۂ عثمانیہ کے ایڈیٹر بھی تھے۔ شاعر تو تھے ہی خاص حیدرآباد کے تھے جسے اس زمانے میں بلدہ کہا جاتا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں کراچی چلے گئے اور سنا تھا کہ کچھ سال پہلے کراچی سے وہاں چلے گئے جہاں سب کو جانا ہے۔ محمد علی نیّر مخلص آدمی تھے۔ جو آدمی مخلص ہوتا ہے وہ شریف بھی ہوتا ہے۔ میرے طول طویل نام کی قطع برید انہوں ہی نے کی تھی، بہ حیثیتِ مدیر۔ اس زمانے میں مدیر کی حیثیت ذرا زیادہ عرفی ہوا کرتی تھی، یہ اس لئے بھی مجھے پسند تھے اور یہی وجہ ہے کہ میں ہمیشہ کسی نہ کسی نیّر کی تلاش میں رہتا ہوں۔ حکم چند نیّر بھی ہیں لیکن وہ خالص علمی آدمی ہیں اور میری پہنچ سے باہر ہیں۔ رحمن نیّر ہیں، مدیر بھی ہیں لیکن شاعر نہیں ہیں۔ بس لے دے کر میرے لئے یہی ایک صلاح الدین نیّر رہ گئے ہیں۔ نہایت وضع دار شیروانی پہنتے ہیں اور شیروانی کے سوا کچھ نہیں پہنتے (مطلب یہ کہ آج تک میں نے انہیں بُش شرٹ جیسے عوامی پوشاک

میں نہیں دیکھا) ۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ شیروانی میں بٹن اور ہک اس لئے ہوتے ہیں کہ مکمل لگے رہیں۔ شیروانی تو اور بھی شعراء پہنتے ہیں لیکن صرف مشاعرے میں، اور وہ بٹن نہیں لگاتے ۔ صلاح الدین نیّر جس سلیقے سے شیروانی پہنتے ہیں اسی سلیقے سے شعر کہتے ہیں۔ اردو گوئی کو تو جیسے انہوں نے اپنے لئے مختص کر رکھا ہے۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے تو ان کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ "صلاح الدین نیّر قابلِ رشک حد تک پُرگو اور زُود گو شاعر ہیں"۔ صحیح لکھا ہے (وہ اکثر و بیشتر صحیح بھی لکھا کرتے ہیں) اور ڈاکٹر حسینی شاہد اس بات پر خوش ہیں کہ صلاح الدین نیّر کی سعادت مندی میں کوئی فرق نہیں آیا ۔ ویسے انہوں نے (یعنی ڈاکٹر حسینی شاہد نے) صلاح الدین نیّر کو ایک ذہین، شائستہ اور صاحبِ ذوق شاعر بھی پایا ہے، شکر ہے۔ نیّر نے کیا اچھا مصرعہ کہا ہے۔
' تھی قلندر کی امانت اُس کو لوٹائی گئی '۔ اور یہ بھی صحیح ہے ۔
جن کو جانا تھا جن کو جا چکے میدان چھوڑ کر ۔ ہم جیسے سرفروش ہی لشکر میں رہ گئے
صلاح الدین نیّر تیغ و تبر کے شاعر نہیں ہیں (یہ اُن کا مزاج نہیں ہے) لیکن کبھی کبھی تیر کمان سے بھی کام لیتے ہیں۔ اور تیر کو زہر میں نہیں بجھاتے کیونکہ وہ اسے دھوکہ دہی سمجھتے ہیں۔
پھولوں کا زمانہ ہو کہ پتھراؤ کا موسم ۔ ہر حال میں تم سر کو اُٹھائے ہوئے رکھنا
شاہینِ نظر، تیشہ بہ کف وہ سرِ مغرور ۔ ہم جیسے فقیروں کے گھرانے میں ملا ہے
کلیوں سے پھول بننے کا جب وقت آگیا ۔ پہلو بچا کے سب سے نسیمِ سحر گئی
پروفیسر ابو ظفر عبد الواحد اور ڈاکٹر سیدہ جعفر دونوں اس بات پر متفق

ہیں کہ نیّر کی شاعری چاہت اور پیار کی شاعری ہے اور شاعر کو زندگی سے پیار کرنے کا سلیقہ ہے۔ اتفاق سے میں بھی یہی رائے رکھتا ہوں لیکن یہ تقلید نہیں ہے صرف تعقید ہے۔ صلاح الدین نیّر کو خوشبو سے بڑا پیار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ اُن کے خاص شوق کی چیز ہے۔ (یہ اعتراض نہیں ہے)۔

خوشبو کے ساتھ آیا تھا یادوں کا قافلہ ۔ سمٹی ہوئی کبھی مری تنہائیاں نہ تھیں

تم اپنی یادوں کی خوشبو بھی ساتھ لے آنا ۔ اُداس اُداس سی ہے بزمِ دوستاں جاناں

یوں تو راس آئی ہے نیّر تازہ موسم کی ہوا ۔ پیار کی خوشبو سے میرے گھر کو مہکائے گا کون

عطر میں بھیگی ہوئی سانسوں کی خوشبو کی طرح ۔ میرا ماضی شب کی چادر اوڑھ کر سوتا ہے کیوں

صلاح الدین نیّر واردات قلبی کے لئے جو شبک اور ریشمی زبان استعمال کرتے ہیں۔ اسی زبان میں وہ زندگی کی واردات اور سانحات کو بیان کرنے کا گُر بھی جانتے ہیں۔

صبح آزادی اُجالوں کی ضمانت تھی مگر ۔ اس ادا سے روشنی آئی کہ بینائی گئی

دیر تک چھنتی رہی دیوار و در سے روشنی ۔ محفلِ زنداں میں جتنی بار سجائی گئی

پھر نظمِ گلستاں اسی قاتل کے ہات ہے ۔ منسوب جس سے شہر کی ہر واردات ہے

زود گوئی اور پُر گوئی شاعر کے لئے اچھی صفات ہیں، لیکن صرف اُس وقت تک جب شاعر کو یہ یاد رہے کہ یہ صفات خطرہ بھی ہیں۔

(۱۹۸۷ء)

ڈاکٹر حسن الدین احمد

سلسلہ پھولوں کا

ایک ادبی ذوق رکھنے والے نوجوان سے روزنامہ نظام گزٹ نے خواہش کی تھی کہ اخبار میں شعر و سخن کا کالم کا اضافہ کرے۔ چنانچہ یہ نوجوان ہر ہفتہ اُردو کے ایک ممتاز شاعر کا انتخابِ کلام شائع کیا کرتا تھا۔ یہ کالم اِس قدر مقبول ہوا کہ ایک دن حضور نظام میر عثمان علی خاں نے دریافت کیا کہ یہ صلاح الدین نیّر کون ہے۔ سب شاعر ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اسی حیدرآباد میں جب اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں نظام حیدرآباد، سفرِ کلکتہ سے کامیاب و کامران لوٹے تو شہر حیدرآباد میں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ دیوان دیوڑھی کے پاس ایک کمان پر ایک قطعہ لکھوایا گیا تھا۔ شاہِ دکن نے اس قطعہ کو بہت پسند کیا اور شاعر سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ عہدہ دار متعلقہ، طلبی کا مژدہ لے کر شاعر کے گھر پہنچے تو ۲۰ سالہ جلال الدین توفیق دوسرے دروازے سے باہر نکل چکا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میر عثمان علی خاں استفسار سے آگے بڑھتے اور نیّر سے ملاقات کی خواہش کرتے تو یہ بھی توفیق کی طرح گھر سے باہر نکل جاتے۔

صلاح الدین نیّر نے دوسرا ماحول پایا۔ ان کو حکومت کے مرکزی دفاتر

(سکریٹریٹ) میں کام کرنے کا موقع ملا اور اس سطح پر کام کرنے کا موقع ملا جس پر ساری اہم کارروائیاں تکمیل پاتی ہیں۔ صلاح الدین نیّر طبیعتاً یار باش ہونے سے نہ صرف اپنے ہم درجہ ساتھیوں میں مقبول رہے بلکہ عہدہ داروں میں بھی ان کی رسائی رہی اور اچھی رسائی رہی۔ انہوں نے اس غیر معمولی موقف سے یہ فائدہ اُٹھایا کہ بے شمار لوگوں کی مدد کی۔ بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو ان کے مسودات پر گرانٹ دلوائی۔ سینکڑوں ضرورت مند لوگوں کے صداقت ناموں، متعدد نوجوانوں کے پاسپورٹ کی اجرائی کے سلسلہ میں بالاتر عہدیداروں کی تصدیق حاصل کی۔ اہلِ غرض حضرات کی ممکنہ مدد کی۔ جو شخص بھی اپنے کام کے لئے اُن سے ملنے سکریٹریٹ جاتا اُسے مایوسی نہیں ہوتی تھی۔

صلاح الدین نیّر نے یہ سب کام اپنی طبیعت کی افتاد کی بناء پر کئے۔ کبھی اُن کے دل میں ذاتی مفاد کا خیال نہیں آیا۔ اگر وہ چاہتے تو سکریٹریٹ میں اپنی موجودگی سے اور اپنے اثرات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ان خدمات کا نقد معاوضہ حاصل کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج وہ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں یہ لکھنے کے موقف میں ہیں کہ۔ "میں نے ساری ملازمت کے دوران نہ تو رشوت لی اور نہ ہی کسی قسم کے تحفے قبول کئے۔ شائد یہی وجہ ہے کہ میں آج معاشی طور پر قانع رہنے کے علاوہ معاشرہ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوں، زندگی کے کسی مرحلے پر بھی میں نے اپنے وقار اور طرزِ حیات کو دغدار ہونے نہیں دیا۔"

مدد کرنے کا جذبہ صلاح الدین نیّر میں اتنا رچا بسا ہے کہ میں اس کو جارحانہ کہہ سکتا ہوں۔ اہل معاملہ کی مدد کرنے کی بات اس حد تک تو سمجھ میں آسکتی

ہے کہ کوئی شخص ان کے پاس پہنچا اور انہوں نے اس کی ممکنہ مدد کی لیکن مدد کرنے کے معاملہ میں صلاح الدین نیّر اس سے بہت آگے ہیں۔ اپنے آفس کو جاتے ہوئے ان کی نظر چند افراد پر پڑتی ہے جو ایک درخت کے نیچے کھڑے ہیں، وہ آگے بڑھ کر دریافت کرتے ہیں کہ وہ کس کام سے آئے ہیں، پھر ان کو ساتھ لے کر متعلقہ عہدہ داروں کے پاس جاتے ہیں اور ان کا کام نکالتے ہیں۔

صلاح الدین نیّر بنیادی طور پر خلیق، منکسرالمزاج اور نرم گفتار ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں بھی خوشبو اور پھولوں کی بات کرتے ہیں لیکن جب معاملہ خودداری اور عزت نفس کا آئے تو وہ سخت رویہ اختیار کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے۔ سرکاری ملازم اکثر و بیشتر سہمے سہمے رہتے ہیں اور عہدہ داران بالادست کے سامنے مودبانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں۔

"آندھرا کے بعض سکشن آفیسروں نے مجھ سے (جبکہ میں اسسٹنٹ سکشن آفیسر تھا) تحکمانہ انداز سے کام لینا چاہا لیکن میں نے انہیں اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے نہیں دیا اور میں نے کسی مقام پر بھی اپنی شخصیت کو مجروح ہونے نہیں دیا۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا رہا۔"

جو لوگ صلاح الدین نیّر کی طبیعت سے واقف ہیں ان کے لئے ان کے اس غیر معمولی رویہ کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ جب انہوں نے اپنے ایک اعلیٰ عہدہ دار کے جاری کردہ احکام تبادلہ کے خلاف منسٹر متعلقہ سے دباؤ ڈلوایا تو عہدہ دار نے ان کو بلایا اور ناراضگی کا اظہار کیا۔ اس پر وہ اس عہدہ دار سے یوں

مخاطب ہوئے۔

"میری پوری سروس میں آپ پہلے آفیسر ہیں جو اپنے اسٹاف
کے ساتھ اس قسم کا نامناسب رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں.
آپ کی دعا سے سارا سکریٹریٹ میری ہتھیلی میں ہے۔"
تب عہدہ دار نے کہا کہ یہ بات آپ مجھ سے کہہ سکتے تھے۔ منسٹر
صاحب کو زحمت دینے کی کیا ضرورت تھی"۔ تو صلاح الدین نیر
نے جواباً کہا۔

"آپ سے کوئی ملازم بھی بات کرنا پسند نہیں کرتا۔ اس لئے کہ
آپ کا رویہ اپنے ماتحتین کے ساتھ اچھا نہیں ہے۔"
زیر نظر کتاب میں سابق حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کی متعدد
جھلکیاں ملتی ہیں۔ جاترائیں جو تہذیبی جشن کا منظر پیش کرتی تھیں۔ ہندو
مسلم سب کا شریک ہونا۔ ہمنا باد میں محرم کے جلوس میں سینکڑوں ہندو مسلمانوں
کا عقیدت کے ساتھ شریک ہونا اور ایسی ہی بے شمار باتوں کا ذکر اس کتاب
میں ملتا ہے۔ صلاح الدین نیر نے یہ بھی بتایا ہے کہ پولیس ایکشن کے وقت
ہمنا باد کے دو ہندو تاجروں کی وجہ سے جو فوج کے ساتھ تھے مسلمانوں کا جانی یا
مالی نقصان نہیں ہوا۔

قید میں تصنیف و تالیف کا کام کرنے کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔
صلاح الدین نیر کو نظر بند ہونے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی لیکن فسادات
کے دوران جب کرفیو نافذ ہوا اور وہ اپنے ہی گھر میں قید ہو گئے تو انہوں نے

لکھنے کا ارادہ کیا۔ فضاء شاعری کے لئے غیر موزوں اور ناسازگار تھی۔ اس سے پہلے ان کے ۸ شعری مجموعے شائع ہو چکے تھے لیکن ان کی کوئی نثری تخلیق سامنے نہیں آئی تھی۔ شاعر کے لئے اپنے میدان کو چھوڑ کر نثر کے میدان میں قدم رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ صلاح الدین نیّر کی یہ کوشش ایک کامیاب کوشش رہی۔ اس کتاب میں زبان و بیان کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ خود نوشت سوانح عمری لکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس میدان میں نہ انکساری کام آتی ہے نہ انانیت۔ زیر نظر کتاب میں مصنف نے حقائق اور واقعات کو پیش کیا ہے اور صفائی سے کام لیا ہے۔ یہ ایک سلجھی ہوئی شخصیت کی ترجمانی ہے جس میں اعتدال سے کام لیا گیا ہے۔

صلاح الدین نیّر نے ان عہدہ داروں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے انہیں ضرورت مند ملازمین کے سلسلہ میں یا سکریٹریٹ کی اردو اسوسی ایشن کے روح رواں کی حیثیت سے سابقہ رہا۔ اِن عہدہ داروں کا ذکر وہ نہایت خلوص سے کرتے ہیں۔ ان کا یہ انداز اس لئے نبھ جاتا ہے کہ سخت گیر اور غیر سنجیدہ عہدہ داروں پر وہ سخت تنقید بھی کرنے سے نہیں چوکتے۔

-۲-

(یہ مضمون نظام کلب میں ۵ رمئی ۱۹۹۲ء کو سکریٹریٹ سے وابستہ اعلیٰ عہدہ داروں کی جانب سے منعقدہ تہنیتی تقریب میں پڑھا گیا۔)

عاشق شاہ

صلاح الدین نیّر

ایک انسان - ایک شاعر - ایک دوست

صلاح الدین ایوبی سے لے کر صلاح الدین نیّر تک کتنی صدیاں گذر گئیں لیکن آج بھی صلاح الدین ایوبی موجود ہے۔ صلاح الدین ایوبی محض ایک علامت نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ اور ایک کڑوی سچائی ہے جو زندگی کے ہر محاذ پر تنہا لڑ رہا ہے!

میں توہمات کا قائل نہیں، لیکن کبھی کبھی توہمات کو نہ مانتے ہوئے بھی توہمات کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ حالانکہ اس کے پیچھے نہ کوئی منطق ہوتی ہے اور نہ کوئی سائنٹفک استدلال۔ استثنائی صورتوں کو چھوڑتے ہوئے یہ بات دل میں اُترتی ہی چلی جاتی ہے اور عقل دور کھڑی تماشہ دیکھتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر صلاح الدین کے اس نام کو لے لیجئے۔ یہ نام جس کسی شخصیت سے جڑا ہوا ہوگا وہ متحرک، فعال اور باعمل ہوگا۔ خواہ اس کا کسی بھی شعبۂ حیات سے تعلق کیوں نہ ہو۔ میں اس نام کی تاثیر ہی کہوں گا جو اس کو نچلا نہیں بیٹھے

دیتی۔ اور صبح سے بڑی رات تک حرکت میں رکھتی ہے۔ ادب کے میدان میں اب صلاح الدین نیر کو ہی دیکھئے۔ ادبی شخصیتوں میں ایسے فعال آدمی میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔

شائد ہی کوئی ادبی جلسہ اور مشاعرہ ہو جہاں نیر موجود نہ ہوں۔ کہیں مہمان خصوصی ہیں تو کہیں جلسے کی صدارت کر رہے ہیں اور کہیں خود کسی جلسے کے کنوینر ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کسی بیمار دوست کی مزاج پرسی کے لئے دواخانہ جا رہے ہیں۔ اور کسی دوست کے بیٹے یا بیٹی کے کالج میں داخلے کے لئے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ یا پھر کسی بے روزگار کو روزگار دلانے کے لئے اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کر رہے ہیں۔ اور پھر ان تمام مصروفیتوں کو جاری رکھتے ہوئے کسی عزیز یا دوست یا شناسا کی میت کو کندھا دے رہے ہیں۔ اور پھر شام شام کو دونوں شہروں کے کسی بھی محلے میں منعقد ہونے والی شادی بیاہ کی تقریب میں بھی شرکت کریں گے۔ اس بیچ میں ان کی وہ مصروفیتیں بھی شامل ہیں جب وہ اپنے دوستوں کے نثری اور شعری مجموعوں کو چھپوانے کے لئے اپنا پیٹرول جلا کر پریس کے بار بار چکر لگا رہے ہیں، جیسے یہ ان کا اپنا نجی اور ذاتی کام ہے۔ میں نے یہاں تک دیکھا ہے کہ اگر صاحبِ کتاب نے پیسے نہیں دیئے ہیں تو نیر، جناب سید نور محمد مالک اعجاز پرنٹنگ پریس کو اپنی جیب سے پیسہ ادا کر رہے ہیں۔ کیا اس سے کوئی انکار کر سکتا ہے؟

اگر کوئی صلاح الدین نیر سے دن کے تین یا چار بجے یہ کہہ دے کر دونوں شہروں کے کسی آخری کونے میں رات کے 9 بجے مشاعرہ منعقد کروانا

ہے تو وہ اپنے ذاتی ٹیلیفون پر مختلف شعراء کو اطلاع دیں گے، اور مشاعرہ کے انتظامات کے لئے کئی افراد سے ربط پیدا کریں گے۔ دیکھتے ہی دیکھتے شامیانہ نصب ہو جائے گا۔ شطرنجیاں بچھ جائیں گی۔ اور قطاروں میں کرسیاں رکھ دی جائیں گی، اور ڈائس کو دلہن کی طرح سجانے کے بعد ٹھیک دس منٹ نو بجے نیر مائیک پر اعلان کریں گے کہ معزز سامعین! اب مشاعرہ شروع ہوا چاہتا ہے۔

مشاعرہ برپا کر کے رات کے کوئی ڈیڑھ دو بجے گھر پہنچیں گے اور صبح مشاعرہ کی رپورٹنگ لکھیں گے جو دوسرے دن کے اخبارات میں چھپے گی۔ مشاعرے صلاح الدین نیر کی کوئی ذاتی ملکیت تو نہیں ہیں جسے انہوں نے اپنے نام رجسٹر کروالیا ہے۔ اب تو وہ خلیجی ممالک کے مشاعرے بھی پڑھ رہے ہیں اس کے بعد وہ لندن، امریکہ اور نہ جانے کہاں کہاں جائیں گے۔

■■

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

گُلِ تازہ - رشتوں کی مہک - سلسلہ پھولوں کا

ادھر گذشتہ چند برسوں میں حیدر آباد میں جو شاعر منظر عام پر آئے ہیں، صلاح الدین نیر بھی اُن ہی میں سے ایک ہیں۔ اُردو کے تقریباً تمام شاعروں نے اپنی شاعری کی ابتداء غزل گوئی سے کی ہے۔ صلاح الدین نیر ٹھیٹ غزل گو شاعر ہیں۔ ان کا مجموعۂ کلام "گُلِ تازہ" غزلوں پر مشتمل ہے۔ شاعری کا دماغ سے زیادہ دل سے تعلق ہوتا ہے۔ نیر کی شاعری دل اور جذبات اور احساسات کی ہے۔ "گُلِ تازہ" خود ان کے اس شعر کی تفسیر ہے ؎

ہر شعر مرا پرتوِ احساس ہے نیر
جو دل پہ گذرتی ہے وہی بات کہوں گا

نیر کی غزلیں اُن کے غم سے عبارت اور سلگتی یادوں، ناکام آرزوؤں تشنہ کام تمناؤں، بے منزل خوابوں اور دوشیزہ حسرتوں سے مزین ہیں۔ وہ میر اور جگر جیسے منفرد غزل گو شاعروں سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری کا یہ عنصر قطعِ نظر اس کے خود ان کی انفرادیت جو ابھی انگڑائی لے رہی ہے ان دونوں کا امتزاج جتنا پختہ کار ہوگا نیر آگے چل کر ادب میں اتنے ہی

نمایاں اور بلند مقام ہوں گے۔ نیئر نے علامتیں اور اشارات وہی استعمال کیے ہیں جو کلاسیکی ہو چکے ہیں۔ غزلوں کو نیا لباس پہنانے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں، جس کا آغاز کرنے والوں میں فیض احمد فیض کا نام ممتاز ہے۔ ان سے ہم آہنگ ہونا اور ان کی ترویج میں حصّہ لینا ہمارے نئے شاعروں کا فرض ہے، اور یہ بڑی اچھی اور صحت مند علامت ہوگی۔ یہ روایت سے بغاوت نہیں بلکہ عصرِ حاضر کے نئے تقاضوں کے مطابق روایت کو نکھارنا اور سنوارنا ہوگا۔ نیئر کے ہاں "کتنے حسین خواب حقیقت پسند ہیں" جیسی چند غزلوں میں غزلوں کا نیا انداز ملتا ہے۔ نیئر کا تصور بلند ہے اور فکر نازک، انھوں نے انسانی جذباتِ محبت کو بڑے سلیقے، شائستگی اور پُرکاری سے چھیڑا ہے۔ ان کے ہاں ثقیل اور وزنی الفاظ، محاورات اور استعارات نہیں ملتے۔ اُنھوں نے جذبات کو سیدھے سادے طریقے پر پیش کر دیا ہے جیسا کہ ان کے دل میں تھے ان کے خلوص سے ان جذبات کو ایک نیا بانکپن مل جاتا ہے۔

("گلِ تازہ" - تبصرہ - رہنمائے دکن)
(۱۹۶۵ء)

○

○ "گلِ تازہ" سے "رشتوں کی مہک" تک صلاح الدین نیئر کی شاعری کا یہ مجموعہ ایک نئی منزل کی سمت گامزن ہے۔ صلاح الدین نیئر کے اب تک چھ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نیئر کی شاعری ابتدائی دور میں زیادہ

ہلکی پھلکی، سُبک، چنچل، مہکتی اور مہکاتی اور گاتی گنگناتی شاعری تھی۔ موضوعات بھی سجیلے، محبوب اور پاکیزہ محبت کے موضوعات۔ ان کی شاعری پر غالب رہے اور یکے بعد دیگرے جیسے جیسے ان کے شعری مجموعے سامنے آتے گئے اُن کی شاعری، گہرائی اور فکر کی حامل ہوتی گئی اور دھیرے دھیرے مسائلِ حیات کو اپنے میں زیادہ سے زیادہ سمیٹنے لگی۔ اِدھر ان کا تازہ مجموعہ "رشتوں کی مہک" میں محبوب اور محبت کے تذکرے ہیں ہی لیکن غیر معمولی ضبط و قرار کے ساتھ۔ چاہنے اور چاہے جانے کے یہ جذبے بلند آہنگی کے حامل ہو چکے ہیں لیکن مسائلِ زیست بھی اپنا حق مانگ رہے ہوں، پرائے غم بھی گویا اُن کے غم بن چکے ہوں اور مجموعی طور پر انسان دوستی کی قدریں ان کی شاعری میں اپنی جگہ بنا رہی ہوں۔ یہ 'رشتوں کی مہک' صرف پیار کے رشتوں کی مہک نہیں ہے۔ انسانیت کے رشتوں کی مہک بھی ہے۔ صلاح الدین نیّر کی شاعری کا یہ موڑ وقیع اور اہم ہے۔

نیّر نے نظمیں بھی کہی ہیں اور بعض بڑی عمدہ نظمیں۔ لیکن سچ پوچھئے تو وہ غزل کے شاعر ہیں اور غزل ہی میں ان کا رنگ نکھرتا ہے۔ قطع نظر اس کے غزل کی زمانہ کچھ ایسی تنگنائے نہیں رہی۔ وہ تو ایک خاصا چوڑا، کشادہ اور ٹھاٹیں مارتا دریا یا ایک بحرِ بیکراں ہے۔ کون سا موضوع ہے جس کو غزل نے اپنایا نہیں ہے۔ خود نیّر نے بھی اپنی غزلوں میں زندگی کے کس کس پہلو پر اظہارِ خیال نہیں کیا ہے۔ بہرکیف نیّر کی غزلوں کی بات ہی اور ہے۔ ویسے ان کی نظم نگاری بھی اپنی جگہ داد طلب ہے۔ بالخصوص بعض نظمیں بے حد

دلکش اور پُراثر ہیں۔ ڈاکٹر زورؔ اور شاذؔ تمکنت کے بارے میں انہوں نے جن تاثرات کا اظہار کیا ہے وہ دل میں اُتر جانے والے ہیں۔ شاذؔ کے بارے میں ان کی تنظم کے یہ دو شعر ؎

بعد اُس کے شہرِ دانش میں بتا خاکِ دکن
بے نیازِ زندگی آشفتہ سر آئے گا کون
خوش نظر، گُلِ پیرہن، شائستگی گفتار میں
بانکپن ایسا لئے ہم کو نظر آئے گا کون

اور آخر میں غزل کے دو شعر بھی ملاحظہ ہوں ؎

پھولوں کا زمانہ ہو کہ پتھراؤ کا موسم
ہر حال میں تم سر کو اُٹھائے ہوئے رکھنا

-:-

غم شناسوں کے لئے یہ وقت ابھی موزوں نہیں
گفتگو ہو گی کسی دن گردشِ ایام سے

(تبصرہ۔ "رشتوں کی مہک"۔ منصف ۹ مارچ ۱۹۸۷ء)

○ صلاح الدین نیّر ایک خوش گو اور خوش فکر شاعر ہی نہیں ایک اچھے نثر نگار بھی ہیں، اس کا اظہار ان کے اور نثر پاروں سے بھی ہو چکا ہے اور اب ان کی خود نوشت "سلسلہ پھولوں کا" سے بھی ہوتا ہے۔ عام طور پر خود نوشت میں لکھنے والا اپنی ذات کو کچھ زیادہ ہی نمایاں کر دیتا ہے کہ سب کچھ پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ لکھنے والا اپنی حیات، شخصیت اور کارناموں کو ضرور نمایاں کرے لیکن ساتھ ہی اپنے دور کی تحریکات و نیز میلانات اور رجحانات، معاشرتی، سیاسی اقتصادی، تہذیبی اور ادبی حالات بھی واضح ہوں۔

صلاح الدین نیر نے "سلسلہ پھولوں کا" میں کہیں کہیں اپنے پر بہت زیادہ روشنی ڈالی ضرور ہے لیکن مجموعی طور پر ان کی سعی یہی رہا ہے کہ اپنے پس منظر اور اطراف و اکناف کو اُجاگر کریں۔ ابتداء میں انہوں نے اپنے پیدائشی مقام ہمنا باد ضلع بیدر کے حالات پیش کئے ہیں، وہاں کی تہذیبی زندگی اور لوگوں کے رویہ وغیرہ کو ظاہر کیا ہے۔ اسی باب میں ان کی تعلیم اور تربیت کی تفصیل بھی ہے اور ان کے رشتہ داروں، اساتذہ، اور ابتدائی دور کے احباب کے بارے میں بھی لکھا گیا ہے۔ دوسرے حصہ میں ملازمت کی زندگی کا احوال ہے۔ لیکن یہاں اُنہوں نے صرف دفتریت کی باتیں پیش نہیں کیں بلکہ دفاتر کے بھی تہذیبی، معاشرتی اور ادبی ماحول پر روشنی ڈالی ہے۔ مختلف عہدیداروں کا عہدیداروں کی حیثیت سے جائزہ نہیں لیا ہے بلکہ ان کی شخصیت کے ایسے گوشوں کو اُجاگر کیا ہے جن سے ان کی انسان دوستی، رواداری اور ادبی دلچسپیوں کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ اس طرح وہ عہدیدار ایک عام فرد کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ علمی، ادبی

اور تہذیبی سرگرمیوں کے تحت حیدرآباد کی ثقافتی اور ادبی زندگی کے بارے میں صلاح الدین نیر نے نہ صرف اپنے تاثرات تحریر کئے ہیں بلکہ ان اداروں کی سرگرمیوں اور کارناموں پر بھی دلکش انداز میں روشنی ڈالی ہے ۔ اس باب میں حیدرآباد کی ادبی انجمنوں کا تذکرہ بھی ہے ۔ یہاں کے ادبی رسائل کا بھی اور بعض روزناموں کا بھی ۔
ایک حصہ ان کی شعری خدمات کے تذکرے سے معمور ہے ، شعری مجموعے ان کی تزئین و ترتیب میں جن کا تعاون رہا ، انعامات و اعزازات جو صلاح الدین نیر کو ملے اور ملک اور بیرونِ ملک کے مشاعرے جن میں انہوں نے شرکت کی ، اپنی شاعری کو پسند کرنے والوں کا حال ۔ غرض اس باب میں نیر کی شعری شخصیت سامنے آتی ہے اور آخری باب ان کی منہ بولی بہنوں کے بارے میں ہے جس میں صلاح الدین نیر کی معاشرہ میں مرتبت کا اظہار ہوتا ہے ۔ یہاں اُنھوں نے اپنی منہ بولی بہنوں کی گھریلو زندگی ان کی ادبی و شعری خدمات ، ان کی صلاحیتوں اور اپنے تعلق سے ان کے رویہ کو بیان کیا ہے ۔ اُردو شاعروں نے یوں بھی کم ہی خودنوشت لکھے ہیں ۔ نیر نے " سلسلہ پھولوں کا " سے حیدرآباد کی صحافتی اور ادبی تاریخ کو صفحۂ قرطاس پر محفوظ کر دیا ہے ۔ حیدرآباد کے چار سو سالہ جشن کے موقع پر اس کتاب کی اہمیت اور نمایاں ہو جاتی ہے ۔
یقین ہے اہلِ حیدرآباد ہی نہیں بلکہ حیدرآبادی تہذیب سے دلچسپی رکھنے والے بھی اس خودنوشت کا خیر مقدم کریں گے ۔

("میرا مطالعہ" منصف ۔ ۲۵ ؍ اکتوبر ۱۹۹۲ء)

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

"داستانِ دل"

"گُلِ تازہ" حیدرآباد کے جواں سال شاعر صلاح الدین نیّر کے کلام کا مجموعہ ہے۔ صلاح الدین نیّر کی شعرگوئی کی عمر ۱۰، ۱۲ سال ہے۔ وہ پابند و معرا نظمیں بھی لکھتے ہیں اور غزلیں بھی۔ لیکن غزلوں کی جانب زیادہ مائل ہیں جس کا اعتراف انہوں نے دیباچہ میں بھی کیا ہے اور شاید اسی وجہ سے انہوں نے اپنے اس مجموعہ کو غزلوں کے لئے مختص کیا ہے۔

نیّر کی غزلوں کا موضوع عشق ہے وہ بھی کوئی ماورائی اور افلاطونی نہیں بلکہ اس دنیا کا سیدھا سادا پُرخلوص عشق ہے جس کا محبوب جیتا جاگتا اور اپنے وجود کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ گُلِ تازہ میں جذبات اور احساسات کی ایک سیدھی سادی دنیا آباد ہے۔ اشعار ہلکے پھلکے، سادہ اور سلیس ہیں جس میں انہوں نے فلسفے کی گتھیاں نہیں سلجھائیں، حیات انسانی کے سربستہ رازوں سے پردہ اُٹھانے کی سعی نہیں کی، جو دل پر گذری اس کا اظہار کردیا۔ عشق کی آنچ نے نیّر کو احساس کی تپش کو اور بڑھادیا ہے جس کی بنا پر اُن کا ہر شعر داستانِ دل بن گیا ہے۔

ہر شعر مرا پرتوِ احساس ہے نیّر۔ جو دل پہ گذرتی ہے وہی بات کہوں گا

نیرؔ کی شاعری میں محبت کی زندگی کے تمام نقوش، پہلو اور کیفیتوں کا بیان ہے جن کے اظہار میں شاعر نے کسی جھجک یا تحفظِ ذہنی سے کام نہیں لیا۔ نیرؔ کے مزاج کی سنجیدگی، متانت، وقار، بُردباری اور عزم اُن کی شاعری میں بھی جلوہ گر ہے۔ گُلِ تازہ میں کئی ایسے شگفتہ، سنجیدہ اور بلیغ اشعار مل جاتے ہیں جو اُن کی شاعری کے تابناک مستقبل کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں غالبؔ کی انا، فانیؔ کا غم، حسرتؔ کی کامرانی اور جگرؔ کی سرمستی کے اچھے نقوش مل جاتے ہیں۔ زبان و بیان اور مضامین کے اعتبار سے ان کے اشعار جدید غزل کی کسوٹی پر پورے اُترتے ہیں۔ نیرؔ کا محبوب، محبت میں برابر کا شریک ہے۔

غالباً آپ بھی روتے ہی رہے ساری رات ۔ ہائے! یہ بکھری ہوئی زلف یہ پھیلا کاجل

گُلِ تازہ کا شاعر "تجھ کو جینا ہے تو حالات سے رنجیدہ نہ ہو" کی تلقین کرتا ہے۔ اُس نے کثرتِ غم سے نباہ کر کے اسے جزوِ زندگی بنا لیا ہے۔ اس مضمون کا کیا ہی خوبصورت شعر ہے۔

سب کو کہاں نصیب ہے نیرؔ نشاطِ غم ۔ اک میں ہی ہوں کہ رہتی ہے غم کو مری تلاش

ایک اور شعر

راس آگئیں حیات کی ایذا پسندیاں ۔ بھرتے ہیں دل کے زخم تو بڑھتی ہے پھر خراش

نیرؔ کی رومانیت، عشق کی صداقت، سادگیٔ بیان اور اِن سب کے ساتھ اُن کی خوش الحانی نے انہیں مقبول شاعر بنا دیا ہے۔ حیدرآباد کے نوجوان شعرا میں وہ اپنی ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ اپنے فکر و فن پر اسی طرح توجہ دیتے رہیں تو مستقبل میں وہ یقیناً اہم شاعر کی حیثیت سے اپنے مقام و مرتبہ کو اور بلند کر سکتے ہیں۔

(آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو نشر ہوا)

ڈاکٹر طیب انصاری

یارانِ شہر۔ خوشبو کا سفر

دراز قد، کھڑا چہرہ، ستواں ناک اور لمبی لمبی ڈگیں۔ یہ ہیں صلاح الدین نیّر جو ہمیشہ شیروانی زیب تن کئے کوچۂ روپ لال سے دفتر سیاست تک اور دفتر سیاست سے عابڈس پر ادبی ٹرسٹ بک ڈپو پر تھوڑی دیر کے لئے رکے اور پھر فتح میدان کی شاہ راہ سے ہوتے ہوئے سکریٹریٹ تک پہنچ جاتے ہیں، لیکن سکریٹریٹ بھی ان کی آخری منزل نہیں ہے۔ دم لینے کی جگہ ہے راستہ میں بھی جانے کہاں کہاں رکتے اور کتنے ہی لوگوں سے ملاقاتیں کرتے ہیں۔ پنچایت راج کے محکمہ سے تعلق ہے لیکن اکثر دوسروں کی پنچایتوں میں اُلجھے رہتے ہیں۔ شب و روز کی شعری اور ادبی سرگرمیوں سے فرصت کہاں ملتی ہوگی کہ فائیلوں کی طرف توجہ دیتے۔ لیکن اس کے باوجود دفتر کا کام بھی ہر دوسرے غیر دفتری کام کی طرح وقت پر ختم ہو جاتا ہے۔ آفیسر بھی ہمیشہ خوش نظر آتا ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ یہ کام وقت پر کرتے ہیں اور اچھا کرتے ہیں بلکہ اس وجہ سے بھی کہ یہ پنچایت راج کام اور ادبی پنچایتوں کا کام زیادہ کرتے ہیں اور سلیقہ سے کرتے ہیں اس لئے حکومت نے اُنہیں ازراہ ادب نوازی سکشن آفیسر (گزیٹیڈ) بنایا ہے۔

نیئر رفتہ رفتہ حیدرآباد کے ادبی حلقوں کی ضرورت سے بڑھ کر کمزوری بنتے جا رہے ہیں۔ یہ بات یوں ہی نہیں ہے اس میں ان کے خلوص، محنت، شاقہ اور دیانت داری کا بھی بہت کچھ دخل ہے مثلاً یہ کہ ادبی ٹرسٹ کا کام برسوں سے کر رہے ہیں اور انتہائی ذمہ داری سے کر رہے ہیں۔ محفلِ خواتین کی سرگرمیوں میں اضافہ کے لئے ان کی کاوشیں کارفرما ہیں۔ 'خاتونِ دکن' کی اشاعت عرصہ تک ان کے خلوص کی مرہونِ منت رہی۔ زندہ دلانِ حیدرآباد سے وابستہ ہیں۔ سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے بانی اور معتمد ہیں اور سکریٹریٹ کی ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کے پیچھے ان ہی کی دستگیری شامل ہے۔ 'غزلوں کی رات' کا مصور رسالہ ان ہی کی شب و روز محنت کے نتیجہ میں اشاعت پذیر ہوتا ہے۔ ان انجمنوں اور اداروں سے ہٹ کر شہر اور اطراف شہر جو مشاعرے ہوتے ہیں اُن کی تشہیر اور تنظیم میں حصہ لیتے ہیں۔ شہر میں چاہے اُردو مجلس ہو کہ راشٹرپتی نیلائم میں صدر جمہوریہ کے اعزاز میں مشاعرہ ہو، چیف منسٹر کے ہاں مشاعرہ ہو کہ گورنر کے یہاں مشاعرہ ہو، نیئر ہی کو دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے۔ ان ساری کارگذاریوں اور کارستانیوں کی روشنی میں اب بھی آپ نہیں کہیں گے کہ نیئر ہماری شعری اور تہذیبی سرگرمیوں کے لئے ناگزیر ہے۔ یہ تو خیر نیئر کی فنی مصروفیات کا احوال ہوا۔ ان کی اہم مصروفیات میں ملک کے مختلف شہروں کے مشاعرے پڑھنا ہے۔ حیدرآباد کے ہر مشاعرے میں آپ صلاح الدین نیئر کو ترنم سے کلام سناتے ہوئے پائیں گے۔ ان کے شعر اور ترنم سے محفل جھوم جھوم جاتی ہے۔

نیئر کے اب تک دو شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں اور تیسرا زیرِ طبع ہے۔

زخموں کے گلاب پر ۱۹۷۲ء کی مطبوعات پر اُتر پردیش اُردو اکیڈیمی نے انعام بھی دیا ہے۔ ان کے پہلے مجموعۂ کلام "گلِ تازہ" کا تلگو میں منظوم ترجمہ ہو چکا ہے۔
صلاح الدین نیّر حیدرآباد کے اُن نوجوان شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے سنہ ۱۹۶۰ء کے بعد حیدرآباد کی زمینِ شعر سے اپنا سر بلند کیا۔ سنہ ۱۹۶۰ء سے یہ روزنامہ 'سیاست' سے وابستہ ہیں، ان کی ذہنی تربیت میں سیاست کو بہت زیادہ دخل ہے۔ اُردو کالج، اُردو مجلس اور اُردو ہال کی علمی اور ادبی سرگرمیوں سے وابستگی نے بھی ان کی صلاحیتوں کو اُجاگر کیا۔ وہ اپنے دور کے ترقی پسند اور جدید رجحانات سے کبھی بھی بے خبر نہیں رہے۔ وہ ہر نئے اور پرانے رجحان سے متاثر ضرور ہوئے لیکن انھوں نے اپنے آپ کو ان میں سے کسی بھی ایک رجحان کے نذر نہیں کیا۔
نیّر نے زخموں کے گلاب کے پیش لفظ میں کہا ہے کہ وہ شاعری میں کسی خاص ازم پر ایمان نہیں رکھتے۔ نیّر نے بڑی وضاحت سے حدیثِ دل میں اپنے خیالات و میلانات کو پیش کیا ہے۔ حدیثِ دل کے مطالعہ سے نیّر کے ذہن تک رسائی ممکن ہے۔ یہاں دو ٹوک باتیں ملتی ہیں۔ ایک بات تو واضح طور پر سامنے آئی کہ وہ کوئی بھی "ازم" کے قائل نہیں ہیں لیکن ان کا ایقان ایسی شاعری پر ہے جو زندگی سے پیار کرنا سکھاتی ہو اور جو انسانی جذبات اور جمالیاتی احساسات کو متحرک کرنے کے علاوہ سماج کے سلگتے ہوئے جسم کو موسمِ بہار کا لباسِ فاخرہ پہناتی ہو۔ نیّر کا یہ ایقان یقیناً خوب ہے۔
زخم، نیّر کی زندگی کا کُل سرمایہ ہے۔ شاعر کی زندگی کے اس المیہ کو دیکھ کر قاری کے دل میں ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ نیّر کی صداقت پسندی

کا قائل ہو جاتا ہے۔ اس قسم کا اعتراف اور اس قسم کی حقیقت پسندی بہت کم شاعروں کو ملتی ہے۔

"گلِ تازہ" کا غم، چمن میں روز افزوں کھلائے، مرجھاتے پھولوں کے غموں کو تازہ کر دیتا ہے۔ یہ غم انفرادی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی ہوتا ہے۔ اس لئے بھی جب نیر اپنے ہی پلکوں کی نمی مانگتا ہے تو خواہ مخواہ ہماری پلکیں نم ناک ہو جاتی ہیں۔ میں نے کسی موقع پر کہا تھا کہ مجھے نیر سے مستقبل میں ایسی امید بھی ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں اور صداقتوں کا نقیب بن جائے گا۔ شعر کہنے کا سلیقہ نیر کو خوب آتا ہے۔ اظہار کی سادگی اور لفظوں کا دروبست شعر کی خوبیاں ہیں۔ فنی اعتبار سے وہ اپنے ہم عصروں میں کسی سے پیچھے نہیں۔ میں یہ کہنے کے موقف میں ہوں کہ نیر امید کے مطابق زندگی کی حقیقتوں سے قریب ہو گیا ہے۔

زندگی کے تجربات اور مشاہدوں نے اس کی شاعری میں زندگی کے چراغوں کو روشن کیا ہے۔ کچھ ایسے ہی روشن روشن شعر آپ بھی سنیئے۔

اے دوست کئی بار یہاں ٹوٹ چکا ہوں ۔ تب جا کے ترے شہر میں آئینہ بنا ہوں
یہ کیسی بزم ہے ہر اک نگاہ پیاسی ہے ۔ یہاں بھی اپنے ہی گھر کی طرح اداسی ہے
بڑے خلوص سے ہم آ گئے تھے مے خانہ ۔ مگر یہاں بھی وہی مصلحت شناسی ہے
متاعِ ہوش یہاں سب نے بیچ ڈالی ہے ۔ تمہارے شہر کی تہذیب ہی نرالی ہے
خلوص بانٹتا میں سب کے گھر گیا لیکن ۔ تم آج آئے ہو جب میرا ہاتھ خالی ہے

اس موقع پر نیر کی شاعری کے بارے میں سوائے اس کے کچھ اور کہنا نہیں ہے کہ ان کا شعری مستقبل اور بھی زیادہ روشن، زیادہ تابناک ہے۔

محترمی عابد علی خاں کے نزدیک یہ 'تائر' ہے۔ عابد صاحب ایک ذہین صحافی ہیں، اس وجہ سے بھی شبہ ہوتا ہے کہ وہ نیتر کو 'تائر' کیوں پکارتے ہیں۔ جب وہ دفتر سیاست میں ہوتے ہیں تو تائر کی آواز سے پہلے ہی پہنچ جاتے ہیں۔ اس سے نیتر کی اس عقیدت اور محبت کا پتہ چلتا ہے جو انہیں عابد صاحب سے ہے۔

جگر صاحب کا رویہ قدرے مختلف ہے وہ نیتر کو نہ صرف اس کے تخلص سے پکارتے ہیں بلکہ کلام بھی سیاست کے کالموں میں شائع کر کے ان کی شعری صلاحیتوں کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ شعری منظم کا کام بھی اکثر و بیشتر ان ہی سے لیتے ہیں۔ وہ ہر وقت عابد صاحب اور جگر صاحب کا دم بھرتے ہیں۔ یوں بھی ان کا کہنا ہے کہ عابد صاحب اور جگر صاحب ایک شخصیت کے دو نام ہیں۔ اس لئے عابد صاحب کا احترام بھی جگر صاحب کی عزت کرنے کے برابر ہی ہے اور یہ بات غلط نہیں ہے۔ عابد صاحب اور جگر صاحب کی دوستی قرونِ وسطیٰ کے بزرگوں کی دوستی کی یاد تازہ کرتی ہے۔ اب ایسے دوست کہاں، ایسی دوستیاں کہاں۔ نیتر وفاداری بشرطِ استواری ہی کو اصلِ ایمان سمجھتے ہیں۔ اس لئے کبھی عابد صاحب ہوں کہ جگر صاحب، کھنہ صاحب ہوں کہ لوتھر صاحب، حبیب الرحمن صاحب ہوں کہ حسینی شاہد صاحب۔ زینت ساجدہ ہوں کہ عظمت آپا ہوں، کوئی کام دیں اور بھول جائیں مگر نیتر نہیں بھولیں گے اور یہ بھی اس انداز میں کہ ماتھے پر بَل نہ چہرہ پر تھکن، ہمیشہ خنداں اور شگفتہ نظر آتے ہیں۔

نیتر وضع داری کے معاملے میں بھی اتنے ہی اصول پسند ہیں جتنے

اصول پسندی کے معاملے میں وضع دار۔ جہاں وہ وعدہ نبھانے کے معاملے میں چاق ہیں وہیں شیروانی پہننے کے سلسلہ میں پابند ہیں۔ نیرّ پر موسموں کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ چاہے وہ موسم گرما ہو کہ سرما ہر وقت شیروانی پہنے نظر آئیں گے۔ سنہ ۱۹۴۸ء کے ادھر مثل مشہور تھی "آنگ میں شیروانی، گھر میں پریشانی" میں نے نیرّ کو شیروانی پہننے کے باوجود خوشحال پایا ہے۔ پہلے کے شعراء مفلوک الحال ہوا کرتے تھے چونکہ نیرّ گزیٹیڈ شاعر ہیں اس لئے انھوں نے پرانی شعری روایات پر ضرب کاری لگائی ہے۔ نیرّ صاحب سے ملنا چاہیں تو کسی سے اُن کا اتہ پتہ پوچھ کر اپنی جہالت کا ثبوت نہ دیں۔ سیاست کی نکڑ پر صبح ۱۰ بجے سے ۱۰½ بجے تک اور شام ۵½ سے ۶½ بجے تک کھڑے ہو جائیے اس دوران جو شخص آپ کو شیروانی میں ملبوس دفتر سیاست کی طرف مڑتا ہوا نظر آئے گا وہی صلاح الدین نیرّ ہیں۔

(خاکہ "یارانِ شہر" مارچ سنہ ۱۹۷۶ء)

○

○ صلاح الدین نیرّ برصغیر ہندوپاک کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ نیرّ کی شعری ریاضت بے تکان ہے اور وہ ملک کے ہر چھوٹے بڑے رسالہ اور اخبار میں چھپتے ہیں۔ اپنے کلام کی اشاعت سے اس طرح وہ اپنے

وجود کے احساس کو تازہ و زندہ رکھنا چاہتے ہیں ۔ ان کی سب سے بڑی خوبی ان کے اپنے وجود کا احساس اور اس وجود کو دوسروں سے منوانے کی متواتر جدوجہد ہے ۔ میں نے جدوجہد کا لفظ یوں ہی استعمال نہیں کیا ہے ۔ میرے ذہن میں وہ سارا معاشرہ اور وہ سارا ادبی ماحول ہے جس میں ہم لوگ زندہ ہیں ۔ ہم لوگ بہت کم کسی کی قابلیت اور صلاحیت کا اعتراف کرتے ہیں ۔ خصوصاً نیّر کا ہمارے معاشرہ کے جس قبیلہ سے تعلق ہے وہ خود کے سوا بہت کم کسی کو تسلیم کرتا ہے ۔ اسی بناء پر غالب کو بھی اس بات کی شکایت تھی کہ میر جیسے خود سر شاعر نے شعراء کی ریل پیل کے باوجود ڈھائی شعراء کے وجود کو تسلیم کیا تھا ۔ ان حالات میں نیّر ہی پر کیا منحصر ہے ، نیّر کی طرح بیسیوں شعراء کو اس پل صراط سے روز ہی بلکہ ہر لمحہ گذرنا پڑتا ہے ۔ نیّر کی اس خود اعتمادی اور جہد پیہم کی ہر دم ستائش کرتا ہوں ورنہ ان کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ اپنا پانچواں شعری مجموعہ خوشبو کا سفر جو تمام تر جدید اور نئی شاعری پر مشتمل ہے عالم وجود میں آیا ۔ میں صرف ان کا قاری نہیں ہوں بلکہ بحیثیت دوست ان کے ذہن کی لمحہ لمحہ تبدیلی کو بھی محسوس کرتا ہوں ۔ محترمی عابد علی خاں نے پیش لفظ میں کہا کہ

" کئی مرتبہ مجھے نیّر سے کہنا پڑا کہ سروجنی نائیڈو کی سالگرہ
تقریب منعقد ہو رہی ہے ، آریہ بھٹ فضا میں داغا گیا ہے
شہر میں کرفیو ہے ۔ حیدرآباد کی تہذیب متاثر ہو رہی ہے ،
نیا سال آرہا ہے اور تمہیں شعر کہنا ہے ۔ نیّر نے ہر
ایسے موقع پر شعر کہے ہیں ۔ "

واقعتاً سب کچھ میرے سامنے ہوتا رہا ہے، نہ صرف یہ بلکہ اکثر و بیشتر اوقات محترمی محبوب حسین جگر جب بھی اخبار کے کام سے اکتا جاتے ہیں تو نیر کو آواز دیتے ہیں۔ ہم لوگ سب جمع ہو جاتے ہیں اور نیر کے شعر اور ترنم سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ایسے ہی موقع پر نیر نے ایک غزل سنائی تھی جس کا موضوع حیدرآباد کے حالیہ فسادات تھا اور کرفیو کے دوران تخلیق ہوئی تھی۔ اس غزل کے اشعار آپ بھی پڑھیں۔

اس طرح ہو رہی بسر حادثات میں
دن کو قلم ہے رات کو تلوار ہات میں

پھولوں سے گفتگو کا زمانہ گذر گیا
خنجر زنی کا راج ہے شہر نجات میں

اس طرح بے گناہوں کا بہتا رہا لہو
دن کے اجالے چھپ گئے تاریک رات میں

سب قاتلوں کا چہرہ یہاں ایک جیسا ہے
کس کس کا نام لکھو گے اس واردات میں

نیر اندھیرے اور بھی بڑھتے رہیں تو کیا
ہے روشنی کا اب بھی چلن اپنی ذات میں

ساری غزل حسب حال ہے، خون کے آنسو رلاگئی۔ حیدرآباد کے شب و روز جس طرح برباد ہو گئے اس کی داستاں بڑی دردناک اور غم ناک ہے۔ قلی قطب شاہ کا شہر آرزو جہاں ہندو مسلم شیر و شکر کی طرح تھے اچانک کس طرح ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو گئے۔ یہ ایک ایسا معمہ ہے جس کا حل سب جانتے ہیں مگر گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل کے مصداق سب چپ ہیں۔ خاموش !!! ۔ لہو کی بوندیں اور آہ و زاریاں چنگاری کی مانند کلام نیر میں موجود ہیں۔

نیر کا تازہ شعری مجموعہ " خوشبو کا سفر" اپنے تمام رومانی ماحول اور

رومانی فضاء کے، زندگی سے بہت قریب ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ نیّر کی فکرو خیال کی دنیا بھی انقلابات سے دوچار رہی ہے۔

لگتا ہے نیّر کے شعور و ادراک نے زندگی کی حقیقت کو پا لیا ہے۔ اب وہ جو کچھ بھی کہیں، وہ ایک حساس اور باشعور شاعر کے جذبات و احساسات کا حاصل ہوگا۔ ادراک اور شعور کی یہ منزل بہت کم شعراء کے حصّہ میں آتی ہے اور جس کسی کے حصّہ میں آتی ہے وہ فنکار کو ابدی اور لافانی بنا دیتی ہے۔

نیّر کے اس مجموعۂ کلام کے مطالعہ کے وقت نیکی، سچائی، اخوت، بھائی چارگی اور احترام آدمیت جیسے گلوں کی مہک اور خوشبو محسوس کر رہا ہوں اور اسی وجہ سے بڑی خوشی دلی کے ساتھ میں شعری سرمایہ میں " خوشبو کا سفر" کو ایک خوشگوار اضافہ سمجھتا ہوں۔

صلاح الدین نیّر نے "خوشبو کا سفر" کے بارے میں لکھا ہے۔

" خوشبو کا سفر میں وہ تمام لوگ صدیوں سے شامل ہیں جنھیں آج تک نہیں معلوم کہ ان کا سفر کہاں ختم ہوگا "

اور یہ خیال بھی بڑا روشن اور حقیقت افروز ہے کہ " خوشبو کا سفر" انسان کو کبھی بھی ایک مقام پر ٹھہرنے نہیں دیتا۔ مسلسل سفر، حوصلہ، توانائی اور روح کو تازگی بخشتا ہے۔ یہ سفر ازل سے جاری ہے۔ خوشبو کے سفر کی کوئی آخری منزل نہیں ہوتی۔ "

(اقتباس۔ تبصرہ "سالار" بنگلور۔ مارچ ۱۹۸۳ء)

کیشوراؤ

سابق پرنسپل ہندی آرٹس کالج

صلاح الدین نیّر کے نام۔ "سلسلہ پھولوں کا"

"جس کی محبت میں بڑی متانت اور خودداری ہے"

(ڈاکٹر سیدہ جعفر)

گلِ تازہ ۔ ایک ارمان کے مظہر کا نام۔

زخموں کے گلاب۔ مسلسل درد میں خموش اضطراب کو سکون کا دلاسا دینے کی تمنا۔

شکن در شکن۔ بکھرے ادھوری زندگیوں میں کچھ تلاش کرنے کی جستجو

صنم تراش۔ پتھر کے جسم میں زندگی کے آثار کھوجنے کے جذبہ کا کارفرما ہونا۔

خوشبو کا سفر۔ دور اُفق پر دکھائی دینے والی ایسی منزل، جہاں تک پہنچنے کا ارمان، جسے دیکھنے کی تمنا، جسے پانے کی جستجو میں پیروں کے تلے کے آبلوں کے پانی کو مرہم بنائے رکھ کر چلتے رہنے کے عزم کو سلام۔

دھواں، اور گرد و غبار جس نسل کا خمیر ہوچکا ہے اس میں شعر کہنا، شعر میں بات کہنا، اور بات میں حسین ترین نزاکت کا امتزاج پیدا کرنا اور شگفتگی کی فضاء کو

برقرار رکھنا، ایک انداز بیاں ہی نہیں بلکہ ایک مسلسل عمل ہے۔ یہ عمل، عملِ مسلسل کو ہر بار نئی زندگی عطا کرتا رہے۔ مسائل پہ بات ہو۔ ہزاروں برسوں سے جو کہا جاتا رہا ہے وہ فرسودہ ہو چکا ہے اُسے نئے آہنگ کی نہیں، نئے طرزِ عمل کی ضرورت ہے۔

ایسے ہی کچھ ناموں سے ان پانچ شعری مجموعوں کو یاد کیا جا سکتا ہے۔ جذبات کے اظہار کے لئے جذباتی ہو جانا ایک ایماندارانہ فطری عمل ہے۔

میرا شاعر، میرے شہر کا شاعر، اپنے اندازِ بیاں اور اندازِ سخن سے ایسی کئی محفلوں کا میزباں، نگہباں اور پاسباں بنا رہے، اسی خواہش کے ساتھ "خوشبو کا سفر" کے خوبصورت ترین احساس کو پُرخلوص سلام۔

○

ابھی ابھی دوپہر میں سیاست اخبار کے اوراق کی گردانی کر رہا تھا کہ آخری صفحہ کے پانچویں اور چھٹے کالم پر نظر رک گئی۔ پڑھا "جناب صلاح الدین نیّر کے مجموعۂ کلام کی رونمائی" بڑی خوبصورت سرخی تھی۔ اس جلسہ میں جو کچھ کہا گیا وہ سننے سے تعلق رکھتا تھا۔ میں بھی اپنے آپ کو وابستہ کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ صاحبہ نے حق بات کہی ہے۔ "پہلے سے چوتھے مجموعہ تک ان کے کلام میں کافی پختگی آئی ہے"۔

عام طور پر میرا رجحان منتریوں (وزیروں) کی زبان سے بات سننے کا عادی نہیں ہے۔ یاگاریڈی صاحب یقیناً بمقابلہ اور منتریوں کے حق گو ہیں اور ادبی ذوق رکھتے ہیں اور ایک طرزِ فکر ہے جس کی وہ ایمانداری سے نمائندگی کرتے ہیں۔

یہ بات واضح کردوں، میں یاگاریڈی یا گنگاریڈی کے بہانے، عام منتریوں کی

نامناسب شرکت پر اعتراض کر رہا ہوں۔ اِن منتریوں کی موجودگی پورے ہندستان کے ہر اسٹیج پر ایک غیر ضروری حاضری ہے۔ ادیبوں کی محفل میں ان کی چنداں ضرورت نہیں۔ پورے ہندوستان میں چار۔ پانچ، دس بارہ منتری، ہو سکتا ہے کہ ادبی ذوق رکھتے ہوں۔

یہ آپ کا چوتھا مجموعۂ کلام ہے۔ صنم تراش میں جو کچھ میں نے تھوڑا بہت پڑھا اور محسوس کیا ہے اس کے تعلق سے صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ درد کا، کرب کا ایک احساس ہے اور احساس ایسا کہ اس میں چبھن کی پوری شدت ہے لیکن برداشت و صبر کی بھی ایک سرحد ہے۔

"جہاں کچھ لوگ
اپنی زندگی کے کرب کو
خاموش پیتے ہیں
بہت ہی دور رہتے ہیں
ریاکاروں کی بستی سے ۔ ۔ ۔ ۔

"گھر سے دور" اس نظم کو میں نے شخصی طور پر سب سے زیادہ پسند کیا ہے کیونکہ یہ میرے ذہن کے قریب ترین خانے سے پوری طرح سے جُڑی ہوئی ہے۔ میں شوالوں اور مسجدوں کا اب تذکرہ نہیں چاہتا۔ ان کو ہم نے کافی بدنام کر لیا ہے۔ نئے شیخ و برہمن تو ہمارے رہنما ہیں جو منزلوں کو منزلوں سے دور کر دیتے ہیں اور ہر قسم کا فساد اور ہڑتال ان کا اولین مذہب ہے۔ آدمی راہوں میں کھو گیا ہے۔ ویرانوں میں ویرانے اُسے ملے ہیں اور یہ سڑکوں پر اپنے وجود کا پرچم لہراتے ہیں۔

میں حیدرآباد میں ایک اور نئے مخدوم کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ نہ جانے میرے تصور کا مخدوم مجھے ملے یا نہ ملے۔ لیکن اتنا احساس ضرور بار بار ہوتا ہے کہ

"چنبیلی کے منڈوے" کی بو باس کی دھرتی سے کبھی تو سُرخ سویرا ہوگا۔

○

دوردرشن حیدرآباد سے قومی نظم سننے کے بعد — !

یہ سلام صرف اس کو جس نے آج حیدرآباد دوردرشن سے کچھ کہا ۔ یہ نہ تو نظم تھی، نہ تو گیت ۔ نہ ہی غزل اور نہ ہی رباعی۔ قصیدہ نہیں ایک خوبصورت مرثیہ تھا۔ مرثیہ اور خوبصورت کتنا تضاد ہے۔ میں نے جان بوجھ کر اسے مرثیہ بھی کہا ہے اور خوبصورت بھی۔ یہ ایک آواز ہے۔ شاعری کی ہر صنف سے اس کا تعلق ہے۔ اور کسی بھی صنف سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ صرف ایک "دل" ہے۔ کسی ایک فرد کا آدمی کا اور کسی ایک انسان کا نہیں بلکہ یہ دل ہے ہندوستان کے اس شخص کا جو مندر میں ہے نہ مسجد میں، گرجا میں اور نہ گردوارہ میں بلکہ یہ ایک آتش کدہ ہے۔ اس احساس کا جو ہندوستان کے مزدور کا محافظ ہے۔ کسان کے لئے خوشبودار بالیوں کی زندگی کا، غربت اور افلاس کی دہلیز پر کھڑا ملک جسے خدا کا نام لینے والے شاہی امام' بھگوان کی بات کرنے والے اڈوانی نے ایک موڑ پر لاکر کھڑا کر دیا ہے جس موڑ پر خوف کی حکمرانی ہے۔ ایسا ماحول بنادیا گیا ہے کہ اب ایک دوسرے کو "شک" بھرے چشمے کے سوا کسی اور چشمے سے دیکھ ہی نہیں سکتا۔ ان لوگوں نے مندر اور مسجد کے نام پر انسان کے خون سے کھیلنا شروع کر دیا ہے۔ مندر کے لئے ہم دھرم کی ہولی جلانے لگے ہیں اور مسجد کے نام پر ایک مذہب کو آلۂ کار بنادیا گیا۔ ایک زرخیز زمین کو ہم نے بڑی ہی ایمانداری سے درندوں کے حوالے کر دیا ہے۔ مسجد کی اذاں کی پاکیزگی کو برباد کر رہے ہیں۔ مندر

سے آنے والی ناقوس کی صدا کو آگ لگا دی ہے۔ ہم لوگوں سے آپ نے جو کچھ کہا ہے اسے میں ایک "دستاویز" کہوں گا۔ آج جن لوگوں نے اپنا کلام سنایا وہ کلام نہیں تھا۔ وہ اس ملک کے مستقبل کے لئے ایک تڑپتی تمنا تھی۔ صلاح الدین نیر آج شاعر نہیں تھا وہ تو آج صرف ایک آواز کا نمائندہ تھا۔ ایک آواز جس کا سُریلا پن مسجد کے آنگن سے چمک بن کر نکلے گا۔ مندر کو پھولوں کی سیج دے گا۔

آج حیدرآباد سے یہ آواز نکلی ہے، یہ آواز اُٹھی ہے۔ اسے پوری قوم کے لئے ایک ورثہ کہا جاسکتا ہے۔ میں نے آپ کی تعریف کے لئے نہیں کہا ہے۔ یہ وقت کیلئے ایک ضروری احساس ہے۔ اس بے حس سانس کے لئے جو آج زندگی اور اُمید کے دامن کو موت کے گھاٹ اُتارنا چاہتے ہیں۔ آج لوگ رتھ یاترا کر رہے ہیں اور کچھ لوگ سدبھاؤنا یاترا کر رہے ہیں۔ ایک عجیب حقیقت یہ ہے کہ یہ یاترائیں پیار، محبت کے جذبہ کی مکمل نفی کر رہے ہیں۔ یاترائیں حل نہیں ہیں کسی مسئلہ کا! آج ہندوستان کو جگانا ہے۔ آدمی کو جگانا ہے۔ درپردہ مقاصد کے حصول کے لئے یہ ایسے اوزار اور ناکارہ ہتھیار ہیں جو کبھی بھی کامیابی کی اُمید نہیں جگا سکتے۔ فنکار جگائیں اس ملک کے آدمی کو، سیاست کے میدان کے بادشاہ (شاہ) ہاتھی، گھوڑے اور پیادے مات کھا جائیں گے جب ہندوستان کے آدمی کو ادیب، شاعر اور گیت کار جگائیں گے۔ آج حیدرآباد دور درشن سے جو کچھ کہا گیا وہ بذاتِ خود ایک مستقبل کی ایسی تصویر کا تصور ہے جس میں ہر رنگ ایک سانس ہے، ایک زندگی ہے، ایک اُمید ہے، ایک احساس ہے۔ اس انسانی احساس کو سلام۔

تقریباً بیس سال پہلے ایک کتاب پڑھا تھا۔ اس کی سرخی حقیقت میں سرخی تھی۔

نام تھا " اور انسان مرگیا " ۔ گذشتہ ایک مہینے سے اسی آدمی کی تلاش تھی۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ " وہ کیسے مرا " وہ جو کچھ کہتا ' اس سے مجھے ضرور یہ یقین ہوتا کہ اس وقت آدمی اتنا وحشی ہوگیا تھا کہ وہ خون دیکھ کر بھی اپنی گردن شرم سے جھکا نہیں پاتا تھا۔ مگر اس بار وہ " ہم وحشی ہوگئے ہیں " والی تخلیق سے اور آگے بڑھ جاتا اور کہتا کہ اس وقت آدمی وحشی ہوگیا تھا۔ تب شرم جیسا لفظ اپنے چہرہ پر ایک مہین چادر اوڑھ لیتا ' مگر اس بار یہ لگ رہا تھا کہ شائد غیر مہذب ہونے کا اتنا مظاہرہ ہوتا کہ تہذیب جیسا لفظ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موت کے گھاٹ اُتر جاتا اور پھر کسی سخت ترین لفظ کی تلاش میں ہم مسلسل بھٹکتے رہتے۔

شاعر ' ادیب ' کوی ' ساہتیہ کار حقیقت میں وہ ہے جو " احساس کے اظہار کا فنکار ہے " اسے ہم کب تک اُردو والا اور ہندی والا کہتے رہیں گے۔ اِن مصنوعی دیواروں کا انہدام ضروری ہے۔

○

ایک دن صبح بھائی نہپال سنگھ ورما آگئے۔ ایک کتاب دیتے ہوئے بڑی نفاست سے کہا کہ آپ کو کچھ کہنا ہے۔ یہ ایک حکم ہی تھا۔ میں سوچنے لگا کہ لکھوں تو کیا لکھوں اور کہوں تو کیا کہوں۔ کتاب ایک شاعر کی تھی ' اور شاعر نے شاعرانہ طرز پر نثر کی اس کتاب کا نام بڑی نزاکت سے " سلسلہ پھولوں کا " رکھا۔ اور قوس میں لکھا ہوا تھا " خود نوشت " اور سرورق کے آخری حصہ پر " صلاح الدین نیئر " لکھا ہوا تھا۔ پہلے صفحہ کے کھولتے ہی بڑے پختہ لفظوں سے آراستہ ایک

مختصر ترین عبارت نظروں کے سامنے تھی۔ ایک جز تھا "اپنے بہترین دوست" اور دوسرا جز تھا "ممتاز دانشور" اور اس مختصر ترین جملہ کے آخری حصّہ میں لکھا ہوا تھا "خلوصِ دل کے ساتھ"۔ بہترین دوست لکھنے کا انہیں پورا حق حاصل ہے۔ کسی کے حق پر غاصبانہ حملہ کرنے کا کسی کو بھی کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ دوسرا جز ایک خیال یا ایک جذبہ کی عکاسی کرتا ہے۔ مجھے "ممتاز دانشور" کہہ دیا گیا۔ یہ ایک خوبصورت غلط فہمی ہے۔ ایسی غلط فہمی آج ایک عام رواج ہو گیا ہے۔ ہر دوست اپنے دوست کو تقریباً "کچھ نہ کچھ" سمجھنے کی غلطی کر ہی دیتا ہے۔ میں نہ ممتاز ہوں اور نہ ہی دانشور یہ سچ ہے کہ میں ایک دوست ضرور ہوں۔ "خلوصِ دل کے ساتھ" کتاب کو حاصل کرنا میرا ایک فرض تھا۔ دوسرے صفحہ پر ایک شعر تھا۔ اس کا مصرعہ ماضی، حال اور مستقبل کی عکاسی کر رہا تھا۔ "جنوں کا قافلہ چلتا رہے گا" یہ قافلہ چلتا رہا تھا، چل رہا ہے اور یقیناً چلتا رہے گا۔ ادب کے کارواں کے مسافر تھکتے نہیں اور رکتے نہیں ہیں۔

قیام گاہ کا نام "کہکشاں" ہے۔ رات کی تاریکی میں صبح کا احساس زندہ ہے۔ انتساب میں دو نام ہیں۔ جناب عابد علی خاں اور جناب محبوب حسین جگرؔ جن کی سرپرستی میں شاعر کا ذہنی سفر، خوشبو کے سفر کی طرح جاری ہے۔ یہ دو نام، صرف نام ہی نہیں ہیں یہ کچھ قدروں کے محافظ نام ہیں۔

"سرگزشتِ دل" سے کتاب کے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ گلبرگہ یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالرزاق نے گلبرگہ کے ایک طالب خواجہ معین الدین کو صلاح الدین نیّرؔ کی شاعری پر مقالہ لکھنے میں ہر ممکنہ تعاون کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اسی ایک بات نے شاعر کے دل میں خیال پیدا کیا کہ "کیوں نہ اپنی خود نوشت" لکھوں۔ اور یہ کتاب اسی خیال

کا حاصل ہے۔ فسادات کے ماحول میں کرفیو کے زمانے میں فرصت ہی فرصت تھی۔ اپنے حالات سے باخبر رہ کر اپنے ڈرائنگ روم میں رات کے ایک ڈیڑھ بجے تک بیٹھ کر لکھ کر اس کتاب کو مکمل کیا گیا۔ بقول شاعر "بہت کچھ واقعات و واردات شامل ہونے سے رہ گئے ہیں" اور میں نے حتی المقدور زندگی کی مثبت قدروں، رشتوں کی پاسداری، خودداری کے تحفظ و بقا کی کوشش کی ہے۔ اس اعتراف کے بعد اپنی آج تک کی زندگی کے سفر کو قلم بند کرنے کی کوشش کا آغاز اور اختتام ہوا۔ کتاب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے

۱۔ سرچشمہ فیضان (اسلاف کی خوشبو)

۲۔ کارزار حیات (ملازمت، اعلیٰ عہدیداروں سے مراسم۔ ادبی و ثقافتی سرگرمیاں)

۳۔ علمی، ادبی و تہذیبی سرگرمیاں

۴۔ خوشبو کا سفر

۵۔ رشتوں کی مہک

* کتاب کا آخری صفحہ :-

کتاب کے ۱۹ ویں صفحہ پر ایک سرخی ہے۔ سرچشمۂ فیضان۔ اسلاف کی خوشبو اور گھر آنگن۔ اسے پہلا حصہ کہا گیا ہے۔ حقیقت میں یہ ہمناباد کی باتوں سے بھری کہانی کا ایک مختصر ترین ذکر ہے۔ شائد جیسے سنگھ نگر کو ہمناباد کہا جانے لگا جسے راجہ رام چندر نے بسایا تھا یا ہنود آباد کو ہی ہمناباد کہا جانے لگا۔ شاعر کے آباء واجداد بیدر سے ہمناباد آئے، جہاں ان کا خاندان ابراہیم بھائی کے نام سے مشہور ہے۔ شاعر کے والد بزرگوار کا نام محمد شمس الدین تھا، والدہ کا نام رقیہ بی بی تھا۔ اس طرح یہ پورا حصہ افراد خاندان کی ایک طویل فہرست پر مشتمل ہے جس میں محل وقوع کے لحاظ سے دوستوں کا

یا واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ تقریباً صفحہ ۴۵ پر فہرست تھم جاتی ہے۔ غلیل سے کبوتر، تیتر، بٹیر اور مختلف اقسام کے پرندوں کے شکار کا تذکرہ ہے۔ ندیوں اور باولیوں میں تیرنے کی بات ہے، بھیس بدل کر فقیر بن جانے کی بات ہے۔ جیسے رام جی کی مٹھائی کی دُکان پر دھوکے میں ڈال کر کم پیسے دینے کی بات۔ کہتے کہتے یہ کہنا اچھا لگا کر "کبھی کبھی بچپن کی ایسی حرکتوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو بڑی ندامت ہوتی ہے۔ پھر محرم کا ذکر درگاہوں، زیارتوں اور نیازوں کی بات ہوتی ہے۔ مانک پربھو کی جاترا کا تذکرہ بھی ہے پولیس ایکشن کے وقت شاعر کے حیدرآباد میں رہنے کی بات، ہتھیار ڈالنے کے بعد کی سراسیمگی کا ذکر، اُس وقت کی عام افواہوں اور کچھ حقائق کا ذکر بھی اپنی تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق کی ایک داستان ہے۔

تعلیم کے شوق نے شاعر کو حیدرآباد آنے پر مجبور کیا۔ حیدرآباد میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کے سفر کا بھی آغاز ہوا۔ صفحہ ۶۸ پر زندگی کی تقریباً تمام قصوں، کہانیوں اور واقعات کو خط فاصل کے حوالے کر کے اپنی خود نوشت کے حقیقی حصّہ کا آغاز ڈائرکٹریٹ اور سکریٹریٹ کی ملازمت کے حصّہ سے کیا ہے۔

صلاح الدین نیّر کو سیول سپلائز میں کلرک کی حیثیت سے نوکری ملی۔ ۱۶ر جنوری ۱۹۵۷ء کو یو ڈی سی (اپر ڈیویژن کلرک) بنا دیا گیا۔ ۱۵ر مارچ ۱۹۷۶ء کو سکشن آفیسر (گزیٹیڈ) کی حیثیت سے ترقی مل گئی۔

آندھرا کے ملازمین کے احساس برتری کا ذکر ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ لکشمی نارائن نے شاعر کی سینیارٹی کو متاثر کیا تھا۔ اس ذکر میں ذہنی تکلیف کا عنصر صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔ آندھرا کے شریف سکشن افسروں کا ذکر بھی ہے۔ شائد

اچھی زندگی کا آغاز تلنگانہ کے اعلیٰ سپوت راے کنج بہاری لال کے ڈپٹی سکریٹری کی
حیثیت سے آنے کے بعد سے ہوا۔ مسٹر گرو داس، مسٹر این کے سیٹھ (مخدوم کی شاعری)
سکریٹریٹ کے کچھ عہدیدار جو اپنے دور میں بے حد مقبول رہے، ان میں ایس اے قادر
بھارت چند کھنہ۔ ہاشم علی اختر۔ غلام احمد۔ ایس اے واسع۔ محمد تاج الدین۔
ڈی۔ این واگھرے۔ ایس اے عزیز۔ صادق احمد۔ رمن راؤ، سید تراب الحسن۔
خواجہ حمید احمد۔ عبدالمحمود۔ مبشر احمد۔ رشید قریشی۔ سعد حسین سعد۔
غلام دستگیر قریشی۔ نریندر لوتھر۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد۔ محسن بن شبیر۔ ہاشم علی خاں
خالد انصاری۔ اے کے گوئل۔ وینکٹ رمنا چاری۔ آر نرسمہا راؤ۔ وینکٹ رامیا
قابل ذکر ہیں۔

اس حصے کے اختتام پر یہ کہنا کہ "میں نے اپنی ساری ملازمت کے دوران
نہ تو رشوت لی اور نہ ہی کسی قسم کے تحفے قبول کئے" یہ طرز اظہار ایک مکمل شخصیت
کی ایک مکمل تصویر ہے۔ یہ خود اعتمادی بذات خود ایک تحفہ ہے۔ --

احسن علی مرزا

زخموں کے گلاب

صلاح الدین نیّر ہمارے شہر کے جواں سال شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں جو شعر و سخن کی محفلوں کو گرمانے کی روایتی شاعری کے مرحلہ سے گزر کر فکر و تنظر کی پختگی کے دور میں داخل ہو گئے ہیں۔ ان کی شاعری کی افتادِ طبیع شروع ہی سے عاشقانہ ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر کے الفاظ میں "نیّر کی محبت میں بڑی متانت اور خود داری ہے۔ پیار کرنے کا سلیقہ ہے۔ چاہنے اور چاہے جانے کی مچلتی ہوئی تمنائیں ہیں"۔ نیّر کی شاعری پر پروفیسر احتشام حسین کی یہ رائے بھی سخن فہموں کا مرکزِ تنظر بن جاتی ہے کہ اُن کے پہلے مجموعہ گُلِ تازہ کی اکثر غزلوں کا محرک ان کا سماجی احساس تھا جس نے کہیں کہیں واضح سیاسی اظہار کی شکل اختیار کرلی تھی اور اس نئے مجموعہ "زخموں کے گلاب" کی تہہ میں بھی بنیادی طور پر زندگی کا وہی شعور کارفرما ہے۔ طرزِ اظہار میں زیادہ ٹھہراؤ، رکھ رکھاؤ، پختگی اور شاعرانہ کیفیت کی نمود ہے۔

نیّر کی فکرِ شعر "گلِ تازہ" سے "زخموں کے گلاب" تک اس سفر میں ان کے دل کے ٹوٹنے کی جھنکار سنائی نہیں دیتی بلکہ ٹوٹے ٹکڑوں کو نیّر بڑی محبت

سے پھنتے اور لگا نانوں میں انہیں جوڑتے جاتے بھی دکھائی دیتے ہیں اور نیر کی اس محنت کا محرک کونین کی خواہش نہیں بلکہ کسی کے دل میں تھوڑی سی جگہ پالیتا ہے۔

کب میں نے کہا مجھ کو ہے کونین کی خواہش
تھوڑی سی ترے دل میں جگہ ڈھونڈ رہا ہوں

عصری محبت شروع ہی سے نیر کے فن میں رچی بسی ہے لیکن بے محابا اظہار سے وہ دریدہ دہن بننا نہیں چاہتے۔
سوائے حرفِ وفا لب پہ کچھ نہیں آیا ۔ زبان کٹ گئی یاروں کی حق پرستی میں
تم اپنے ہاتھ ذرا سوچ کر بڑھا دینا ۔ بہت سے ہاتھ کٹے ہیں دراز دستی میں
حادثوں کی اس آزمائش کے باوجود ان کو اندر جینے اور جیئے جانے کی بھرپور خواہش ہے کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں

کئی موسم بہ اندازِ خزاں آئے گئے لیکن
نگارِ زندگی پر آج بھی پھولوں کی بارش ہے

"زخموں کے گلاب" میں شامل نظمیں اس بات کی نمائندگی کرتی ہیں کہ نیر اپنے منتخبہ موضوع سے انصاف کرنے کی بڑی پرخلوص کوشش کرتے ہیں ۔ "احساس کی زباں" "وفا کا زخم" "چوڑیاں"۔ "زخموں کے گلاب" کی اچھی نظمیں ہیں۔

(تبصرہ روزنامہ "سیاست" ۲۶ فروری ۱۹۷۴ء)

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

"گلِ تازہ"

ظاہری و معنوی اعتبار سے ایسی حسین کتاب چھپوانے پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ میں آپ کا کلام حیدر آباد کی ادبی محفلوں میں سنتا رہا ہوں اور ہندوستان کے موقر ادبی رسالوں میں بھی نظر سے گزرتا ہے۔ آپ نے اپنے ذوقِ شعری کی تربیت بڑے ریاض سے کی ہے اور بہت جلد وہ مقام حاصل کرلیا ہے جو ادروں کو اچھی خاصی پختگی کی عمر میں نصیب ہوتا ہے بلکہ بعض تو آخر تک ہاتھ پیر مارتے ہیں لیکن تہی دامن ہی رہ جاتے ہیں۔ اللہ تعالی آپ کو خوش رکھے اور دنیا کے مکروہات سے محفوظ۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ یہ ریاض جاری رکھیں گے اور اپنے فن کو خوب سے خوب تر بنانے کی دھن میں کمی نہ آنے دیں گے۔

فنکار کی شخصیت میں اللہ کی ایک صفت تخلیق کی تجلی ہوتی ہے۔ تخلیق کے ساتھ تکمیل کو تو خدا نے بھی وابستہ نہیں کیا۔ فطرت کا ہر قدم امکانات کے نئے پہلو دکھاتا ہے اور ہر نقش پہلے سے زیادہ دلفریب نظر آتا ہے۔ فن کار اگر کسی منزل پر عمر کے کسی حصے میں بھی یہ سمجھ لے کہ میرے فن میں تکمیل کی حد آگئی ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس کا فن ٹھٹھر گیا۔ تخلیق کے سوتے خشک ہوگئے، جولان گاہِ جنوں ختم ہوگئی۔ یہ میں اس لئے لکھتا

ہوں کہ آپ بہترین صلاحیتوں کے انسان ہیں اور ان صلاحیتوں کی تہذیب
و ترتیب کر رہے ہیں۔ اسے جاری رکھیے۔ خونِ جگر سے اس نقشے میں رنگ
بھرتے رہیے لیکن صرف دروں بینی کا شکار ہو کر نہ رہ جائیے گا۔

کائنات کے دو پہلو ہیں اور دونوں میں کونسا زیادہ اہم ہے۔ ایک
کو دوسرے پر ترجیح دینے کا سبب موجود نہیں ہے۔ یعنی ایک انسان کی داخلی
نفسی اور روحانی، ذہنی اور فکری تجربات اور احساسات کی دنیا۔ دوسری
اس کے خارج کی اجتماعی اور مادی یا سماجی، عملی، علم و اسباب اور حوادث
کی دنیا۔ پہلی سے واقفیت حاصل کرنے کیلئے تنہائی، سوچ بچار، دروں بینی
اور دل سوزی کی ضرورت ہے۔ دوسری [illegible] سے روشناس ہونے کے واسطے وسیع
مطالعہ اور گہرا مشاہدہ درکار ہے۔ جب احساس، مشاہدہ اور مطالعہ تینوں ایک
خاص تناسب کے ساتھ فن کار کی شخصیت میں جمع ہو جاتے ہیں تو وہ لیل و نہار
کی زنجیروں سے آزاد ہو جاتا ہے اور ابدیت کی آزاد فضا میں ہمیشہ زندہ رہتا ہے
یہ باتیں آپ کو شاید اور کوئی نہ لکھے، میں اس لئے لکھتا ہوں کہ
صرف واہ واہ تو سبھی کہیں گے۔ میں سچی دوستی اسے سمجھتا ہوں کہ کوئی
ایسی بات بھی کہہ سکوں جس کی روشنی میں آپ اور زیادہ حسن،
توانائی، اعتماد اور اعتبار حاصل کر سکیں۔

مجھے آپ کے مجموعے کی اشاعت سے سچی خوشی ہوئی اور میں یقین
رکھتا ہوں کہ آپ نے اگر آج شہرت اور تعریف کے پُر فریب پھندوں
میں آنے سے انکار کر دیا تو کل یہ غلاموں کی طرح آپ کی خدمت میں
دست بستہ حاضر ہوں گے۔ (۱۹۶۶ء)

--

سری نواس لاہوٹی

صلاح الدین نیّر

پچھلے تین دہوں سے میں نیّر کو قریب سے جانتا ہوں۔ اگر میں غلطی پہ نہیں ہوں تو پہلی بار اُن سے اُردو اورینٹل کالج کے طالب علم کی حیثیت سے متعارف ہوا۔ جب وہ اپنی تعلیم کے سلسلے میں اُردو ہال آیا کرتے تھے جس سے میں وابستہ تھا۔ یہ ان کی شاعری کا ابتدائی دور تھا۔ اُس دور میں جدیدیت نے اپنا سر بلند کرنے کی سعی کی لیکن کسی باشعور شاعر اور ادیب نے جدیدیت کی بارگاہ میں سجدہ ریزی سے گریز کیا۔ ان میں نیّر پیش پیش رہے اور آج بھی ان کی یہ اَنا باقی ہے۔

نیّر بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے اور ایسی غزل کا جو وارداتِ قلبی سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ کوچۂ جاناں میں زلفِ پریشاں کو دیکھ کر صرف مسکرا ہی نہیں دیتا بلکہ اس میں خوشبو کی تلاش کرتا ہے تاکہ رشتوں کی مہک کو استوار کرتا رہے لیکن بسا اوقات اس کی زبان پر حرفِ وفا کے بجائے یہ صدا بھی سنائی دیتی ہے کہ "آتشِ دل کے لئے یہ رُت ابھی موزوں نہیں"۔ ان کی غزلوں میں جو نغمگی پائی جاتی ہے اس کا پرتو ہمیں اس کی خوش الحانی سے بھی ملتا ہے اور جب وہ شعر سنانے پر خلوصِ دل سے آمادہ ہو جاتے ہیں تو بے اختیار ان کے شعر کا بلکہ ان کی خوش الحانی کی بھی داد دینی پڑتی ہے۔

نسیمؔ نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل ان کی پسندیدہ صنف ہے۔ ان کے شعری وجدان میں خلوص پایا جاتا ہے تو وہ اُن کی نعتیں ہیں جن میں انہوں نے رسالت مآبؐ کے دربار میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے اور اس میں ان کے خلوص کا پیمانہ لبریز ہے۔

جہاں تک تنظیمی قابلیت کا سوال ہے وہ ان میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ کوئی محفل ہو کہ کوئی مشاعرہ بغیر نسیمؔ کی تنظیمی صلاحیتوں کے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا ہے اس میں ان کے خلوص کا بھی دخل ہے۔ میں نے ان کو اُردو مجلس اور انجمن ترقی پسند مصنفین میں کام کرتے ہوئے قریب سے دیکھا ہے اور پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کی آبیاری میں نسیمؔ کا بڑا دخل ہے۔ کسی وقت انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک سربراہ نے کہا تھا کہ جب تک رسالہ ہاتھ میں نہ ہو کسی تنظیم کو مکمل طور پر منتظم نہیں کیا جا سکتا لیکن اس سربراہ کی اس رائے کو رد کرنے میں اور P.W.A کو کارکرد بنانے میں جس تن دہی سے انہوں نے کام کیا ہے اس کی گواہی وہ دے سکتے ہیں جو ان سے وابستہ ہیں۔ حیدرآباد کے اُردو شعراء میں اگر کسی میں خلوص کا پیکر تلاش کرنا ہو تو دُور جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی بلکہ یہ وصف صلاح الدین نسیمؔ میں تلاش کریں تو ان کو مایوسی نہیں ہوگی۔ بلکہ انہیں ایک نیا حوصلہ اور نیا آہنگ بھی ملے گا۔

امیر احمد خسرو

صلاح الدین نیرؔ - ایک وضع دار شخصیت

صلاح الدین نیرؔ ایک وضع دار شخصیت کا نام ہے جو اپنے تہذیبی ورثہ کو کلیجے سے لگائے قلندرانہ انداز میں جی رہا ہے۔ میانہ قد، گندمی رنگ، کتابی چہرہ چھوٹی چھوٹی چمکدار آنکھیں" ذہانت و فطانت کی غماز" یہ ہے نیرؔ کا سراپا اور خلوص و محبت اور ہمدردی اس کی فطرت کی آئینہ دار - نیرؔ کی شاعری میں یہی وضع داری اور خلوص بڑی شائستگی کے ساتھ اُبھر کر آئے ہیں۔ نیرؔ اپنی شاعری میں اپنی ذات اور ماحول کی خوبصورت عکاسی کرتا ہے۔ وہ غم جاناں ہو کہ غم دوراں غم ذات ہو کہ غم کائنات، نیرؔ بڑے اعتماد کے ساتھ نرم لب و لہجہ میں اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتا ہے۔ لفظوں کی تراش خراش ایسی کہ شعر میں ایک غنائی ماحول، ایک ترنم کی کیفیت ہوتی ہے۔ نیرؔ اپنی بات بڑے سیدھے سادے لفظوں میں کہتا ہے، کبھی بھی دور از کار، بعید از فہم استعاروں اور تلمیحات یا لفظی شکوہ سے قاری یا سامع کو متاثر کرنے کی کوشش نہیں کرتا - اپنے (۳۰) سالہ شعری سفر میں نیرؔ نے جو کوششیں کیں اور جو تجربات حاصل کئے وہ اس کو بہ حیثیت شاعر معتبر بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔ اس کی

شاعری میں کلاسیکی رچاؤ ہے مگر وہ اپنے گرد و پیش میں رو نما ہونے والے حالات
سے بھی پورے طور پر باخبر ہے اور شعر میں ان کے اظہار و سلیقہ بھی رکھتا ہے
نیر کی شاعری میں کہیں بھی بے راہ روی کا شائبہ نہیں ملتا ۔ اس کی فکر نہ تو
ترقی پسند دور سے وابستہ ہے اور نہ تجریدی دور سے۔ اِن دونوں کے درمیان اس
نے اپنے لئے ایک راہ نکالی ہے۔ اِسی لئے اپنی شاعری کا ایک الگ اسلوب لے
کر چلتا ہے۔ کسی خرمن کی خوشہ چینی نہیں کرتا۔

نیر نے نظمیں بھی کہیں ہیں اور مختلف موضوعات پر اس کے قلم نے
جولانی دکھائی ہے، لیکن ان نظموں میں بھی غزلوں ہی جیسا غنائی ماحول ملتا
ہے ۔ اس لئے میں نیر کو بنیادی طور پر غزل ہی کا شاعر مانتا ہوں۔

حامد بن شبیر

صلاح الدین نیّر کا حسنِ کلام

کچھ دن قبل میں جناب عابد علی خان ایڈیٹر سیاست سے ملنے اُن کے دفتر گیا، جہاں جناب صلاح الدین نیّر سے ملاقات ہوئی۔ اور میں نے اپنی اس خواہش کو دہرایا کہ آن کا مجموعۂ کلام جہاں بھی ملے میں لینا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ زحمت کی ضرورت نہیں، کلام آپ تک خود پہنچ جائے گا، ایک متصل کمرہ سے لاکر اپنے کلام کے دو مجموعے میرا نام لکھ کر حوالے کئے۔

دو تین سال سے خرابیٔ صحت کی وجہ سے مشاعروں میں نہیں جارہا ہوں مگر جب کبھی بھی جاتا تھا تو مشاعروں کا آغاز نیّر صاحب ہی کے کلام سے ہوتا تھا۔ اخبارِ اطلاعات نے بتایا کہ ناظم مشاعرہ بدلتے رہتے مگر نیّر صاحب کا مقام برقرار رہا۔ اس کی کوئی وجہ ہوتی ہے اور ہے۔ کلام کی خوبی پہ مستزاد اُن کا لحن، ترنم اور طرزِ ادا بھی ایسا ہے کہ سامعین متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مشاعرہ کا آغاز کرنا نفسیاتی اعتبار سے بھی ایک ذمہ داری کا کام ہے، نہ کہ صرف حاضرین کا ذوقِ سماعت برانگیختہ ہو بلکہ WELL BEGUN IS HALF DONE کے مصداق ایسی فضا پیدا ہو جائے جو مشاعرہ کی کامیابی کی ضامن ہو سکے۔ یوں تو ہر شگفتہ رنگ و

ہوئے دیگر ست " مگر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حیدرآباد کے نمائندہ شعراء کی فہرست میں نیّر صاحب کا نام بھی اپنی جگہ ستارہ کی طرح درخشاں ہے۔ کلام کا صحیح اندازہ جیسا کہ کہا گیا ہے شاعر کے سنانے سے نہیں بلکہ خود پڑھنے سے ہوتا ہے۔ جونہی وقت نے اجازت دی میں نے نیّر صاحب کا کلام اس ارادہ سے پڑھنا شروع کیا کہ اپنی پسند کے اشعار نوٹ کرلوں گا۔ تھوڑی ہی دیر میں محسوس ہوا کہ مجھے تو تقریباً پورا ہی دیوان نقل کرڈالنا پڑے گا، کیونکہ ہر شعر کوئی نہ کوئی خوبی لئے ہوئے ہے۔ کلام میں ایک ہمہ گیر نوعیت کا تنوع نظر آیا کہ روایتی اقدار کی پاسداری کے ساتھ ایک طرف فلسفۂ حیات، انا و قلندری، حالات حاضرہ، گرم و سرد روزگار، معاشرہ کی نیرنگی، رہبری و رہزنی، پھر ترقی پسند رجحانات کی رہنمائی ہوا سا طہ ہے تو دوسری طرف رومانی پہلو بھی ویسا ہی قوی ہے کہ ناز و نیاز، جفا و وفا، زبانِ بلبل گوشِ گل سبھی کے نقشے یہاں ملتے ہیں۔ کبھی بانگِ درا سنائی دیتی ہے تو کبھی کسی زخمی دل کی آواز کانوں میں آتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک چمنستان ہے جو کسی "گلِ تازہ" کی خوشبو سے مہک رہا ہے۔ جذبات و احساسات کی تصویر کشی، گویا خود بول اٹھتی ہے کہ "آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشہ کہیں جسے"۔ اگرچہ روایتی معشوق تو حضرت غالب کے الفاظ میں وہ ہے جس کا "جلوہ نہ کوئی نام ستم گر کہے بغیر"۔ اور عام نقشہ یوں ہی پیش کیا جاتا ہے جیسا کہ بقول راقم " اُدھر خنجر بہ کفِ قاتل اِدھر ہیں سربکف بسمل "۔ وہ قتلِ عام کا منظر جو پہلے تھا سو اب بھی ہے۔ مگر تصویر کا یہ ایک ہی رُخ ہے۔ نیّر صاحب نے سوزِ پروانہ کے ساتھ گدازِ شمع سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا ہے۔

--

راشد آذر

یہ کیسا رشتہ ہے

ہر شاعر اپنی زندگی کے کچھ گوشے اوروں سے چھپاکر صرف اپنے لئے رکھتا ہے، جہاں وہ اپنے آپ کو آنکھ بھر کر دیکھنا چاہتا ہے۔ چونکہ جلوت میں اپنے آپ کو بہ عجلت دیکھ دیکھ کر بیزار ہو جاتا ہے۔ اِس لئے چاہتا ہے کہ اپنے اس خلوت کدے کو گوشۂ عافیت میں اپنے آپ کو فرصت سے دیکھے۔ اور جب یہ فرصتِ تمام اِس دروں بینی کا تجربہ کرتا ہے تو وہ اِن ساری نجی کیفیات کا تجزیہ کر پاتا ہے، جن پر ایک اچٹتی نظر ڈالنے کی بھی اس کو فرصت نہیں تھی۔ اب وہ اپنے آپ کو اصلی شکل میں دیکھتا ہے، لیکن قصہ یہاں ختم نہیں ہوتا۔ یہاں سے ایک نئے اور مشکل مرحلے کا آغاز ہوتا ہے اور وہ ہے ان نجی تجربات اور کیفیات کا سلیقے سے پوری صداقت کے ساتھ اظہار کرنے کی کوشش۔

بعض شعراء ان تجربات و کیفیات کو جوں کا توں پیش کرتے ہیں اور بعض ان میں ردوبدل کر کے پیش کرتے ہیں۔ دراصل یہ نجی گوشے دوسروں کے لئے کھولنے کی ہر ایک میں ہمت نہیں ہوتی۔ یہ کیسا رشتہ ہے، صلاح الدین نیر نے ان گوشوں کو

ہمارے لئے بڑے پیار سے کھولا ہے۔ جب ہم ان گوشوں میں داخل ہوتے ہیں تو ایک دوست، ایک ہمدرد، غم خوار کی حیثیت سے ایک ناقد کی حیثیت سے نہیں۔ ہم اُن کیفیات کے حصہ دار بن کر وہاں جاتے ہیں، مبصر کی طرح نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو کھرے انداز کا اظہار اِس مجموعے کی نظموں میں ملتا ہے ہم کو بھایا ہے۔ وہ چاک دامن اور دامن دریدہ ہیں اور اسی طرح ہمارے سامنے کھڑے ہیں۔ چاہے وہ عقیدت کی بات ہو، چاہے محبت کی، اندازِ بیان تکلفات سے عاری ہے۔ مثلاً جس انداز سے اُنہوں نے رسولِ اکرم سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے اس کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے۔

شرمندگی ہے سر کو جھکائے کھڑا ہوں ـ عصیاں کا سب حساب مری چشم تر میں ہے

ـ

یہ واقعہ ہے کہ نسبت بڑا سہارا ہے ہجومِ غم میں گنہگار آدمی کے لئے

ـ

عقیدت سے قدموں پہ سر کو جھکانا اگر جرم ہے تو سزا مانگتا ہوں

-:-

جہاں شاہوں کے سر خم ہو گئے ہیں اُسی گھر کا میں ادنیٰ سا گدا ہوں

-:-

رسولِ پاکؐ کی سیرت کا ایک اک لمحہ کھُلی کتاب ہے تفسیرِ آگہی کے لئے

یہ اور اسی طرح کے اور بھی شعر جو نیّر نے لکھے ہیں، وہ عقیدت میں ڈوب کر لکھے ہیں۔ ان کو پڑھ کر کسی قسم کی بناوٹ کا احساس نہیں ہوتا۔

اُن کے عقیدے کے کھرے پن کی شہادت ملتی ہے۔ اِسی طرح جب نسیم محبت کے تجربات کا اظہار کرتے ہیں تو اس جذبے کے مختلف پہلوؤں کا اظہار بغیر کسی تفریق کئے کرتے ہیں۔ مثلاً اس قبیل کی پہلی نظم 'یہ کیسا رشتہ ہے' میں کہتے ہیں

وہ اجنبی ہی اگر ہے تو اُس کے ہونٹوں سے
مہکتی پھول ہے مرے ماں کے دودھ کی خوشبو
کبھی کبھی مجھے محسوس یوں بھی ہوتا ہے
کہیں وہ میری ہی بچھڑی ہوئی بہن تو نہیں

اِن کی ایک اور نظم 'اِسم نویسی' کی اُٹھان اس طرح ہے۔

میں بی۔اے پاس ہوں لیکن مری قیمت نہیں لگتی
شرافت کے کھُلے بازار میں تنہا کھڑا ہوں میں

اس کے بعد جوان اَن بیاہی لڑکی' زندگی سے ہراساں' باپ فکرمند' ماں کا ذکر کرنے کے بعد کہتی ہے

مری مرضی سے اے سوداگرو! موسم بدلتے ہیں
سرِ میخانہ اے چارہ گرو میکش سنبھلتے ہیں
قریبِ میکدہ جاؤں تو ساغر لڑکھڑا جائیں

•

مرے ہونٹوں کو شاعر زندگی کا جام کہتے ہیں
مری زلفوں کو ساون کی گھٹا کا نام دیتے ہیں

اور پھر اس کے بعد ایسی درد ناک حقیقت کے اظہار پر نظم ختم ہوتی ہے کہ جس کا کرب دل میں ہوتا ہے۔

بہ ایں حالات میں اے ہم نشیں! اک شمع ایسی ہوں
کہ میں سہمے ہوئے ماحول میں خاموش جلتی ہوں

لبوں پر بھول کر حرفِ شکایت آ نہیں سکتا
کسی کے آستاں سے سر مرا ٹکرا نہیں سکتا

بازگشت، معاشرے اور تہذیب کی قدروں کے تعلق سے ایک بیان سے شروع ہوتی ہے اور ایک چبھتے ہوئے سوال پہ ختم ہوتی ہے۔

وہ کیا کمی ہے جو یاں تم کو کھینچ لائی ہے

'کہاں ہو تم'، 'یوں ہی سہی'، 'یہ کس کا نام ہے'، 'یوم جمہوریہ ہند'، 'کون قاتل ہے'، 'بہار نالاں ہے ہم نشینو!'، 'زندگی تجھ سے ملاقات تو ہو جاتی ہے' جیسی اور بھی خوبصورت نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں۔ "دلوں کے آئینے دیکھو سنبھال کر رکھنا" راکھی کے مقدس بندھن پر بڑی خوبصورت نظم ہے۔ سائبان، ماں کی وفات پر ایک اثر انگیز نظم ہے۔ "فلسطینی جانبازوں کی آواز" غزل کی ہیئت میں کہی ہوئی نظم ہے۔ اظہار کا یہ طور آج کل کم ملتا ہے۔

--

ڈاکٹر صادق نقوی

ریڈر شعبہ تاریخ، عثمانیہ یونیورسٹی۔ حیدرآباد

نیّر ـــــ شاہراہ سے منزل تک

۱۹۵۹ - ۱۹۶۰ء کی بات ہے جب میں پہلی بار نیّر سے ملا۔ میں نظام کالج میں بی۔ ایس سی کا طالب علم تھا اور نیّر اُردو کالج میں زیر تعلیم تھا۔ بیسویں صدی کے دوسرے نصف حصّے کے آغاز میں نوجوان شعراء کا ایک قافلہ ترتیب پایا جو سب کے سب کسی نہ کسی کالج کے طالب علم تھے لیکن اس قافلے کے مسافروں کو شاعری نے مضبوط رشتوں میں جکڑ دیا تھا۔ میرے علاوہ نظام کالج میں وقار لطیف، ذکی شاداب مجاہد انصاری اور رہیش تھے۔ ویمنس کالج میں اشرف رفیعؔ اور سیدہ مجیدہؔ کا چرچا تھا فائن آرٹس کالج میں سید علی خیالؔ اور ان کے علاوہ دوسرے نوجوان شعراء میں عزیز اقبال، مدہوش بلگرامی اور اکملؔ حیدرآبادی نمایاں تھے۔ اتنی بڑی تعداد میں نوجوان شعرا شائد ہی کسی دور میں یکجا ہوئے ہوں۔ چونکہ ان نوجوان شعراء میں اکثر کا تعلق کسی نہ کسی کالج سے تھا اِس لئے مختلف کالجوں میں مشاعرے ہونے لگے۔ ان مشاعروں نے ان نوجوان شعرا کے ذوقِ شاعری کو بڑا سہارا دیا۔ اِس قافلے میں نیّر کا کردار بڑا مرکزی تھا۔ شعر کہنا الگ بات ہے۔ شعر تو سب ہی شاعر کہتے تھے لیکن شاعری

کو زندگی کی منزل بنا لینا سب کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ منصب نیر کے حصے میں آیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نیر نے اپنے طالب علمی کے دور ہی میں اُردو ہال میں کئی مشاعرے ترتیب دیئے تھے جن میں بزرگ شعراء کے ساتھ ساتھ ہم نوجوان شعراء نے بھی اپنا کلام سنایا تھا۔ زمانہ بہتے ہوئے دریا کی مثال ہے۔ تیزی سے گذرتا رہا' نیر حیدرآباد کی شعری محفلوں کا مرکزی کردار بن گیا' اور آج تک بھی باقی ہے۔

نیر کی شخصیت کے خدوخال مرتب کرنا آسان نہیں ہے' اس لئے کہ نیر کی شخصیت کئی جہتوں میں پھیلی ہوئی ہے' لیکن شخصیت کے اقدار جس مرکز کے گرد دائرے بناتے ہیں وہ ادبی اور شعری خدمات ہیں۔ بیسویں صدی کے آخری نصف حصے میں شاعری میں جو انقلابی تبدیلی آئی اُس میں صدیوں سے چلتی ہوئی روایت آہستہ آہستہ نظر انداز کی جاتی رہیں۔ اکثر اُن شعراء نے جو ۱۹۶۰ء کے بعد اُفقِ شعر پر اُبھرے' ــــ زائد مصروفیت کی طرح شاعری کو اپنایا۔ شاعری جسے شعرائے قدیم نے علم کا درجہ دیا تھا اِس تبدیلی کی زد میں آگئی۔ اِسی لئے اُستاد' شاگرد کا اٹوٹ رشتہ ٹوٹ پھوٹ گیا۔ اِسی کے ساتھ ساتھ شاعری میں نئے تجربات کا دور شروع ہوا۔ نیا ڈکشن' لفظیات اور ہیئت میں تجربے کئے جانے لگے۔ اگر یہ سب کچھ سلامت روی کے ساتھ ہوا ہوتا اور اُسے وہ شعراء اپناتے جن کی شعری قابلیت معرضِ بحث میں نہ آتی تو شائد تجربوں کے نام پر جو بے ہنگام اور بے راہ روی کا راستہ عام ہو گیا نہ ہوتا' لیکن اِس فہرست میں اکثر وہ شعرا شریک ہو گئے جنھیں نہ شعری صلاحیت ملی تھی اور نہ انھیں یہ علم تھا کہ وہ کون سا راستہ اپنا رہے ہیں۔ اپنے کو ایک کارواں میں شریک کرنے کے لئے یہ شعراء اِس کارواں میں شریک ہو گئے اور آبروئے شعر

معروضی بحث میں آگئی۔

یہ سب کچھ نیّر کے شعری سفر کے دوران ہوا لیکن نیّر کی شخصیت کی سب سے مضبوط اساس اُس کا اپنا روایت پر ایقان ہے۔ وہ مصلحت کو اپنانے کا قائل نہیں ہے اِس لئے اُس کی شخصیت کے صرف دو راستے ہیں محبت اور نفرت۔ وہ دونوں جذبوں میں شدید ہے۔ اِس لئے آپ کو دنیائے شعر و سخن میں صرف دو طرح کے شاعر ملیں گے۔ نیّر کے گہرے دوست اور نیّر کے شدید دشمن۔ میں نیّر کا برسوں سے دوست ہوں اور یہ دیکھتا رہا ہوں کہ نیّر کے اطراف شعرا کے حلقے بنتے، ٹوٹتے رہے ہیں۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ اکثر شعراء نیّر کے دوست، مشاعروں میں مدعو کئے جانے کی توقع لے کر بنے، لیکن جب اُنھیں اس میں زیادہ کامیابی نہ ملی تو وہ نیّر سے دور ہوگئے۔ میرے علاوہ نیّر کے ساتھ دو چار ایسے دوست برسوں سے دوستی کی ڈور میں اس لئے بندھے ہیں کہ ہم لوگوں کی دوستی مشاعروں میں مدعو کئے جانے کی شرط پر نہیں ہے۔

نیّر کی طبیعت بڑی حساس ہے۔ جذبوں کا اظہار وہ بڑے بھرپور انداز میں کرتا ہے۔ شاعری اُس کے لئے زائد مصروفیت نہیں ہے بلکہ اُس کی شخصیت کی پہچان ہی اُس کا فن ہے۔ اُس نے کبھی زبردستی شعر نہیں کہے۔ جو دیکھا وہ لکھا۔ جو محسوس کیا اُسے شعر کے سانچے میں ڈھالا۔ اپنے آٹھویں مجموعۂ کلام "یہ کیسا رشتہ ہے" میں نیّر نے خود ہی لکھا ہے "میری ہر نظم کسی نہ کسی، اہم یا غیر اہم واقعہ سے تعلق رکھتی ہے۔ کوئی ایک نظم بھی خیالی یا قیاسی نہیں ہے۔ میں ایسی شاعری کو قابلِ احترام سمجھتا ہوں جو زندگی کے روشن اور تعمیری اقدار کی ترجمان ہو۔"

روایت کے احترام اور تہذیب کے اقدار کو نیّر نے اپنی شاعری کی بنیاد بنائی

ہے۔ یوں بھی نہیں ہے کہ اُس کی شاعری کل کی شاعری ہو۔ وہ حساس دل اور روشن فکر رکھتا ہے اِس لئے اُس کی انگلیاں ہمیشہ وقت کی نبضوں پر رہتی ہیں اُس نے اپنی شاعری میں بڑی خوبصورتی سے کل کی روایت کو آج کے سانچوں میں ڈھالا ہے۔ وہ خود ہی لکھتا ہے "میری شاعری اور میرے نظریہ فکروفن میں کلاسیکی قدروں کے ساتھ ساتھ آپ کو ترقی پسند رجحانات اور عصری آگہی کی مثبت علامتیں بھی ملیں گی"۔ نیّر کی شاعری کا مکمل جائزہ مختصر سے لفظوں میں لینا کم از کم میرے بس کی بات نہیں ہے اس لئے خود نیّر نے جو اپنی غزلوں کے مجموعے "سفر جاری ہے" میں اپنی شاعری کے متعلق لکھا ہے وہی لکھ دیتا ہوں۔ "میری غزلوں میں آپ کو زندگی کی حرارت، صحت مند روایات، کلاسیکل اقدار کی پاسداری، ترقی پسند خیالات اور عصری آگہی کے علاوہ فطرت کی دھوپ چھاؤں، معاشرے کی نرمی گرمی، داخلی احساسات، قلبی واردات کی تازگی، خواب و بیداری کی باتیں، فکروخیال کی سچائی، سرِ شام کی سرگوشیاں، آخرِ شب کی گفتگو، چاند کی ٹھنڈک، سورج کی گرمی، بادِ صبا کے جھونکے اور شبنم کے آنسو ملیں گے۔ میں نے زندگی کی رعنائیوں ہی کو اپنایا نہیں بلکہ حالات کی تلخ نوائی کو بھی اپنے شعروں میں سمویا ہے، میں نے وہی کہا ہے جو میں نے محسوس کیا ہے، میں ایسے ہی ادب کو قابلِ احترام سمجھتا ہوں جو زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہو۔"

نیّر کی شاعری کا یہ کینوس نیّر کی شاعری کی ابتداء سے آج تک جوں کا توں باقی رہا ہے۔ وہ فن کی راہوں پر دیانت داری اور سچائی کا قائل ہے۔ اس لئے اُس کی شاعری میں جا بجا اُس کے شعری فلسفے کی جھلکیاں واضح طور پر ملتی ہیں

تا عمر خود شناسی کا اعزاز کم نہ ہو۔ کچھ اتنا اپنے آپ سے نزدیک آیئے
توفیق نہ ہو جب تک رشتوں کو سمجھنے کی۔ بھیگی ہوئی پلکوں کو مصروفِ دعا رکھنا
تم بھی اُس شاعرِ نم دیدہ سے مل کر کہنا ۔ آج کے بعد کوئی شعر نہ مجھ پر کہنا
خاموش سی نگاہوں نے سب کچھ بتا دیا ۔ کچھ بھی نہیں بچا لبِ اظہار کے لئے
جذبات آنسوؤں کی زباں بن کے رہ گئے ۔ اُس ایک شب کا فاصلہ کتنا طویل تھا
ہم جیسے فقیروں کی پگھلتی ہوئی آواز ۔ تم جیسے رئیسوں کو جگانے کے لئے ہے
آبلہ پائی سے گھبرا کر نہ کر ترکِ سفر ۔ پاؤں جب دہلیز پر ہوں گے تو آنگن آئیگا
عمر بھر خونِ دل جلاتے ہیں ۔ ہے یہی زندگی ادیبوں کی
تمام عمر کٹی اپنی وضع داری میں ۔ انا تو صرف فقیروں کے گھر میں رہتی ہے
میں شاعر ہوں مگر فکر و نظر کی حد وہاں تک ہے ۔ رسائی دیدہ ور روشن ضمیروں کی جہاں تک ہے

نیّر کی شاعری میں احساسِ محرومی، درد و غم، تنہائی کے ساتھ ساتھ ان سب کو بدل دینے کا جذبہ ملتا ہے۔ وہ محرومی اور تنہائی کا صرف مرثیہ نہیں پڑھتا بلکہ اپنے اشعار میں ظلم و استبداد کے خلاف مسلسل جنگ کی دعوت بھی دیتا ہے۔ اُس کی نظم "زادِ سفر" کا آغاز یوں ہوتا ہے ؎

یوں دیکھنے میں شگفتہ ہوں
مسکراتا ہوں
میں کتنے کرب میں ہوں مبتلا
کسے معلوم
سوائے غم

کوئی زادِ سفر نہیں میرا
سوائے دردِ مسلسل
ملا بھی کیا مجھ کو

نظم کے تیسرے بند کا یہ شعر تیر کے احساسِ تنہائی کو اُجاگر کرتا ہے ۔

ہزاروں لوگوں میں رہ کر بھی کتنا تنہا ہوں
تمہارے ایک نہ ہونے سے بے سہارا ہوں

لیکن وہ زندگی کے سفر میں اندھیروں کا راہی نہیں ہے۔ وہ ان ہی درد و غم و تنہائی کی راہوں پر سحر کے آثار بھی دیکھتا ہے اور راہ پر بکھرے ہوئے درخشاں ستاروں کو بھی ، یہی اس کا زادِ سفر ہے جو وہ لفظوں کے پیراہن میں سموکر اپنے قاری تک پہنچاتا ہے۔ اُس کی نظم " ہیں کتنے پھول چمن میں " کے یہ شعر پڑھئے۔ ۔

کچھ ایسے لوگ بھی ملتے ہیں شاہراؤں پر
کہ جن کے چہروں پہ ہے زندگی کی رعنائی
کچھ ایسے لوگ ملیں گے اُداس گلیوں میں
کہ جن کے چہروں سے ٹپکے ہے زندگی کی تھکن
کچھ ایسے لوگ بھی جو سیم و زر کو ٹھکرا ئے
نگاہِ زیست سے ملتے ہیں بے نیازانہ
گھروں میں جن کی کبھی روشنی نہیں ہوتی
وہ لوگ پھر بھی اُجالوں کی قدر کرتے ہیں
خواں نصیب سہی پھر بھی اُن کے دامن میں

کوئی بھی رت ہو مگر پھول مسکراتے ہیں

نیرّ شاعری کے اُس دور میں جی رہا ہے جس میں نئی علامتوں کا استعمال عجیب صورت حال کا شکار ہے۔ یہ علامتیں بعض شعراء کے پاس اتنی مبہم ہوتی ہیں کہ شاعر شاعر کے علاوہ کسی اور کو سمجھ میں نہ آسکیں لیکن نیرّ کی شاعری میں علامات نہ صرف واضح اور صاف ہیں بلکہ ان میں معنویت اور اظہار کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ قلندر، مسند، بوریا، قبیلہ، دستار، کج کلاہی اور ایسی ہی دوسری علامتیں ایک تہذیب سے دوسری تہذیب تک کے سفر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ نیرّ نے اپنی شاعری میں انھیں بڑے سلیقے سے برتا ہے بلکہ ان کے استعمال سے شعر کو گہرائی اور گیرائی عطا کی ہے ۔

وہ بھی کبھی تھا اپنے قبیلہ کا آدمی
کل تیری انجمن سے جو باچشم تر گیا

بے نیازانہ قلندر کی طرح رہتا ہوں ۔ میں جہاں بھی ہوں ہر اک فکر سے بیگانہ ہوں

جس کی مسند چھن گئی ہو اپنے ہی دربار میں ۔ وار ایسے شخص پہ کرنا نہیں آتا مجھے

اپنی تو کج کلاہی رہی ایک وضع پر ۔ بدلے نہ زندگی کے کہیں بھی مرے اصول

قلندرانہ طبیعت تھی وضعدار بھی تھا ۔ فقیر اپنے علاقہ کا شہریار بھی تھا

قدم قدم پہ مری کج کلاہی مائل تھی ۔ میں تجھ کو چھین لوں تجھ سے یہ اختیار نہ تھا

مسندِ سجادگی جب چھین کر لائی گئی ۔ تھی قلندر کی امانت اُس کو لوٹائی گئی

حیدرآبادی تہذیب، مروت اور بھائی چارگی کی بنیاد پر اساس ہے۔ حیدرآباد نے اپنی چار سو سالہ زندگی میں جانے کتنے انقلاب دیکھے۔ قطب شاہیوں کے سنہری دور

کو مغلوں کے حملوں سے تباہ و تاراج ہوتا دیکھا۔ آصف جاہی سلطنت کے زوال کو جمہوریت کے آغاز سے بدلتا دیکھا اور پھر حیدرآباد کی ریاست کو آندھرا پردیش میں تبدیل ہوتا ہوا دیکھا لیکن جس حادثہ نے حیدرآباد کے اربابِ فکر و نظر پر سب سے گہرا اثر چھوڑا، وہ حیدرآباد کے فرقہ وارانہ فسادات تھے۔ شائد ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے اس پُر آشوب دور میں قومی یکجہتی کے قیام کے لئے اپنا زورِ قلم نہ استعمال کیا ہو۔ نیر تو حساس ذہن کا حامل ہے۔ اُس نے اِس میدان میں اپنی ساری صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا۔ نیر کی شاعری کی یہ عصری حیثیت اور اُس کے فکر کا مثبت انداز قاری کو بہت متاثر کرتا ہے ؎

قافلہ تہذیب کا لٹتا ہے تیرے شہر میں ۔ یہ تماشا رات دن دیکھا ہے تیرے شہر میں
آرزوِ تسکینِ دل کی اک اذیت بن گئی ۔ میرے ماضی کے سوا اب کیا ہے تیرے شہر میں
میری شائستہ مزاجی کے سوا سب کچھ لٹا ۔ جتنا پایا تھا وہ سب کھویا ہے تیرے شہر میں
سوچتا ہوں شہر میں یہ حادثہ کیوں کر ہوا ۔ کل تلک جو پھول تھا وہ آج کیوں پتھر ہوا
کیا شہر تھا کس طرح سے برباد ہوا ہے ۔ قاتل کے سوا شہر میں اب کون بچا ہے
ہم جس کو وطن دوست سمجھتے رہے نیر ۔ وہ شخص بھی مردوں کے کفن بیچ رہا ہے

نیر کی شخصیت اور فن کا یہ سرسری جائزہ صرف ایک اشاریہ کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے کہ نیر کی فعال شخصیت کا سب سے روشن پہلو اُس کی ادبی اور شعری محفلوں کے انعقاد اور اُنکی تنظیم سے عبارت ہے۔ حیدرآباد کا شائد ہی کوئی ایسا بڑا مشاعرہ ہوگا جو نیر کے بغیر منعقد ہوا ہو۔ یوں نہیں ہے کہ یہ سب کچھ ماضی کی باتیں ہوں بلکہ نیر اب بھی ویسے ہی رواں دواں ہے جیسے کل تھا۔ خدا کرے اُس کی یہ فعال زندگی طویل ہو۔ --

رئیس اختر

صلاح الدین نیّر

(ایک سرسری جائزہ)

کسی اچھے دوست کے فن اور شخصیت پر قلم اٹھانا جتنا مشکل ہے اتنا آسان بھی ہے۔ مشکل اس لئے ہے کہ کہیں از دیادِ خلوص میں قلم غلو نہ کر جائے آسان اس لئے ہے کہ اس کی زندگی کے تمام پہلو ایک آئینہ کی طرح پاک و صاف نظر آتے ہیں۔

صلاح الدین نیّر کی اور میری دوستی کی عمر زائد از (۳۰) سال کی ہے۔ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ ساری شعراء برادری میں صلاح الدین نیّر میرا سب سے زیادہ عزیز ترین دوست ہے، البتہ یہ محسوس کرتا ہوں کہ نیّر مجھے اپنے تمام دوستوں میں سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ ہماری دوستی کا آغاز مشاعروں کی ملاقات سے ہوا اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں ہم اکثر بیدر، ظہیر آباد، کلیانی اور گلبرگہ میں ہوتے والے مشاعروں میں ساتھ ساتھ شریک ہوا کرتے تھے۔ اضلاع کے مشاعروں میں عطا کلیانوی (بسوا کلیان)، حکیم جامی (ظہیر آباد)، رشید احمد رشید (بیدر)، صابر شاہ آبادی (شاہ آباد) اور گلبرگہ کے مشاعروں میں سرور مرزائی، عبدالرحیم آرزو اور راہی قریشی

مشاعروں میں شریک رہتے تھے۔ دیارِ ادب کے علاوہ بیدر کی کچھ اور انجمنوں کی جانب سے جب کبھی بیدر میں مشاعرے ہوتے، نیرّ حیدرآباد کے شاعروں میں ضرور شامل رہتے۔

جب ہندوستان پر چین نے حملہ کیا تو اُن دنوں آندھرا پردیش میں جناب برہمانندا ریڈی چیف منسٹر تھے۔ اُس زمانے میں سارے ملک میں چین کے خلاف جلسے اور موضوعاتی مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے۔ اُن دنوں جناب قادر علی خان ضلع سنگاریڈی کے کلکٹر تھے (جو اب سٹ وِن کے صدر نشین ہیں) اُنہوں نے مجھے اور نیرّ کو تلگو کے دو اور شاعروں کے ساتھ ضلع کے مختلف مقامات پر ہونے والے جلسوں میں قومی نظمیں سنانے کے لئے مدعو کیا تھا۔ اس ایک ہفتہ کے دوران نیرّ اور میں ساتھ ساتھ رہے۔ تب مجھے نیرّ کو سمجھنے کا زیادہ موقع ملا۔ حیدرآباد میں میری پہلی ملاقات نیرّ سے اُس وقت ہوئی جب میں جامعہ عثمانیہ میں بی۔اے سال اول کا طالب علم تھا اور میاں مشک ہاسٹل کے کمرہ نمبر ۳۰ میں مقیم تھا۔ اسی ہاسٹل میں جناب محمد علیم الدین (ریٹائرڈ اسسٹنٹ سکریٹری پنچایت راج) بھی تھے۔ میں اپنی کم آمیزی کی وجہ سے حیدرآباد کے مشاعروں میں شریک نہیں ہوتا تھا، لیکن صلاح الدین نیرّ کے مسلسل اصرار پر میں حیدرآباد میں مختلف انجمنوں کی جانب سے ہونے والے مشاعروں میں شرکت کرنے لگا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ ہماری دوستی کے اِتنے طویل سفر میں ہم میں کسی وقت بھی اختلاف نہیں رہا۔ میں نے دوستی کے ہر مرحلہ پر نیرّ کو اپنا ایک بہترین دوست پایا۔ پھر ہماری دوستی مثالی بن گئی۔ ہم شہر کے مشاعروں کے علاوہ اضلاع کے مشاعروں

میں شرکت کرتے رہے۔ اُس زمانے میں آندھرا پردیش اور سابقہ ریاست حیدرآباد
کے اضلاع اور تعلقہ جات کھمم، کتہ گوڑم، یلندو، ورنگل، کریم نگر، کرنول، کڑپہ،
نندیال، وجے واڑہ، سنگاریڈی، ظہیر آباد، عادل آباد، محبوب نگر، نلگنڈہ کے علاوہ
بیدر، گلبرگہ، پربھنی، کلیانی، ناندیڑ وغیرہ میں کثرت سے مشاعرے ہوتے تھے۔ ہم
اکثر مشاعروں میں ساتھ ساتھ رہتے۔

صلاح الدین نیر اپنی دیانت داری، اُصول پسندی اور عمدہ صلاحیتوں کی بنا
۱۹۵۹ء سے روزنامہ سیاست سے وابستہ ہیں (جب کہ وہ اُردو کالج میں بی اے میں
کے طالب علم تھے)۔ ۱۹۵۹ء میں نیر اُردو کالج کی بزمِ ادب اُردو کے بلا مقابلہ
صدر منتخب ہوئے اور آخری بین کلیاتی اُردو فسٹیول (۱۹۵۹ء) کے بھی بلا مقابلہ
معتمد مشاعرہ منتخب ہوئے۔ صلاح الدین نیر ایک طویل عرصہ (۱۹۶۶ء) سے ادبی ٹرسٹ
سے بھی وابستہ ہیں۔ ادبی ٹرسٹ اور شنکرجی میموریل سوسائٹی کے کل ہند مشاعروں کے
انعقاد کے سلسلہ میں نیر کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

صلاح الدین نیر مینجنگ ٹرسٹی ادبی ٹرسٹ جناب عابد علی خاں (مدیر سیاست)
کے دستِ راست کی حیثیت سے ادبی ٹرسٹ کے قیام (۱۹۶۶ء) ہی سے بلا معاوضہ
ادبی ٹرسٹ کا کام انجام دے رہے ہیں۔ جناب عابد علی خاں مدیر سیاست اور جناب
محبوب حسین جگر شریک مدیر روزنامہ سیاست نیر پر مکمل اعتماد کرتے ہیں۔ نیر پورے
اعتماد اور بھروسہ کے ساتھ آج بھی ادبی ٹرسٹ اور سیاست سے متعلق اپنی ذمہ داریوں
کو سلیقہ سے نبھا رہے ہیں۔ بزمِ سعدی (فارسی انجمن) (۱۹۵۹ء) کے بانیوں میں سے
ایک ہیں۔ ادارہ اتحاد الشعراء (۱۹۶۶ء) بزمِ جیون اور ادارہ قدرِ ادب کے معتمد عمومی

رہ چکے ہیں۔ سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن (۱۹۶۹ء) کے ۲۳ سال سے بانی سکریٹری ہیں۔ ادارۂ شعر و حکمت سے (جس کے صدر ڈاکٹر مغنی تبسم ہیں) زائد از ۲۵ سال سے معتمد عمومی ہیں۔ زندہ دلان حیدرآباد (۱۹۶۶ء) سے بھی وابستہ ہیں۔ محفل خواتین کے قیام (۱۹۷۱ء) سے ہی مشیر کی حیثیت سے وابستہ ہیں۔ ماہنامہ "خاتونِ دکن" ۱۹۶۲ء سے دس سال تک مدیر اعزازی رہے۔ ماہنامہ شگوفہ کی مجلسِ ادارت میں شامل ہیں۔ میرا شہر میرے لوگ اور "مشاعرۂ دکن" کے جنرل سکریٹری ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے احیاء ۱۹۸۷ء کے وقت سے شریک معتمد انجمن ہیں۔ ان کے علاوہ بھی نیر کی ادبی، شعری و تہذیبی خدمات دیگر انجمنوں کی سرگرمیوں سے ظاہر ہوتی ہیں۔ بی اوایل کی طالب علمی کے زمانے میں تمام کالجس اور جامعہ عثمانیہ کے مشاعروں کے علاوہ تنظیمی اعتبار سے بھی مکمل تعاون کیا کرتے تھے۔ اُردو مجلس (انجمن ترقی اُردو) کے ۱۸ سال تک معتمد عمومی رہ چکے ہیں۔ صلاح الدین نیر کے تقریباً تمام شعری مجموعوں پر ملک کی مختلف اُردو اکیڈیمیوں اُترپردیش، بہار، مغربی بنگال اور آندھراپردیش سے ایوارڈ مل چکے ہیں۔ ان کے علاوہ شہر کی ادبی و تہذیبی انجمنوں اور حکومت کی سطح پر بھی نیر کا سنمان کیا گیا۔ نیر کی ادبی اور شعری خدمات کے اعتراف میں تلگو یونیورسٹی نے ۱۹۹۱ء میں ادبی ایوارڈ دیا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ تلگو یونیورسٹی سے کسی اُردو شاعر کو ایوارڈ دیا گیا۔ تلگو یونیورسٹی کی جانب سے شروع کئے جانے والے ایم اے اُردو کورس کی تدوین کے سلسلہ میں بورڈ آف اسٹڈیز کے رکن رہ چکے ہیں۔

صلاح الدین نیر ملک بھر کی تقریباً تمام ریاستوں کے کل ہند مشاعروں میں کلام سنا چکے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کے ریاستی و مرکزی مشاعروں میں شریک رہتے ہیں۔

اس کے علاوہ سعودی عربیہ (جدہ) ریاض، دوحہ، قطر، کویت کے مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ حال ہی میں جدہ میں منعقدہ مشاعرہ (۳ر ڈسمبر ۱۹۹۲ء) میں شرکت کر چکے ہیں، جس میں راقم الحروف بھی شرکت کر چکا ہے۔ امکان ہے کہ مارچ یا اپریل میں وہ امریکہ کے مشاعروں میں شرکت کریں گے۔

صلاح الدین نیر معاشی طور پر مستحکم شاعر ہے۔ سکریٹریٹ میں گزیٹیڈ عہدیدار رہ چکے ہیں۔ دورانِ ملازمت بے شمار اہلِ غرض اصحاب کی بے لوث خدمت کی ہے۔ اعلیٰ افسروں (چیف سکریٹری کی سطح تک کے عہدہ داروں) سے اپنی شاعری اور سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کی سرگرمیوں کی وجہ سے مراسم بڑھے۔ خاص طور پر حسب ذیل افسروں نے نیر کی جائز سفارشات کی پذیرائی میں کبھی تامل نہیں کیا۔ ایس اے قادر، رائے کنج بہاری لال، بھارت چند کھنہ، ہاشم علی اختر، نریندر لوتھر، غلام احمد، ایس اے واسع، محمد تاج الدین، صادق احمد، رشید قریشی، مبشر احمد، تراب الحسن، ایس اے عزیز، غلام دستگیر قریشی، حسن الدین احمد، خواجہ حمید احمد، بی این داگھرے، گروداس، ہاشم علی خان، غلام جیلانی، رمن راؤ، خالد انصاری، اسد اللہ سعید وغیرہ۔

صلاح الدین نیر کے تاحال (۸) شعری مجموعے (گلِ تازہ ۶۵ء)، زخموں کے گلاب (۷۲ء)، صنم تراش (۷۶ء)، شکن در شکن (۷۹ء)، خوشبو کا سفر (۸۳ء)، رشتوں کی مہک (۸۶ء)، سفر جاری ہے (۸۸ء) اور یہ کیسا رشتہ ہے (۱۹۹۰ء) شائع ہو چکے ہیں۔ نیر، عظمت غزل (عظمت عبد القیوم۔ فن اور شخصیت) اور عظمتِ خیابان (عظمت عبد القیوم) کے مولف بھی ہیں۔ ۱۹۹۲ء میں سلسلہ پھولوں کا کے نام سے اپنی خود نوشت سوانح لکھی ہے۔ اس کے علاوہ صلاح الدین نیر کی

نگرانی میں شاعر اور ادیب دوستوں کی تقریباً (۵۰) کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ نیر کی کتابوں کی رسم اجراء تقاریب شایانِ شان طور پر انجام پائیں، اکثر تقاریب کا کنوینر میں ہی رہا۔ مہانوں میں قابل ذکر ریاست کے دو گورنرس محترمہ کمود بین جوشی اور جناب کرشن کانت کے علاوہ پروفیسر ابو ظفر عبد الواحد، مسز عابد علی خاں، ڈاکٹر سی نارائن ریڈی، ہاشم علی اختر، نواب شاہ عالم خان، جسٹس سردار علی خاں، گوپال راؤ اکبوٹے، ڈاکٹر سید عبد المنان، پروفیسر رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر زینت ساجدہ، ایم باگا ریڈی، ڈاکٹر حسن الدین احمد، پروفیسر گیان چند جین، ڈاکٹر موہن لال نگم اور پروفیسر مغنی تبسم قابلِ ذکر ہیں

حیدر آباد میں اُردو ہندی کے ملے جلے مشاعرے صلاح الدین نیر کی شخصی دلچسپی سے گذشتہ ۱۵، ۱۶ برس سے منعقد ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں اُردو کے شاعروں میں راقم الحروف (رئیس اختر) اور ہندی کے شاعروں میں جناب نیہپال سنگھ ورما کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔ اُردو ہندی مشاعروں کے انعقاد کے سلسلے میں شریک مدیر روزنامہ سیاست جناب محبوب حسین جگر کی سرپرستی اور مشاورت کا بھی بڑا دخل رہا ہے۔

صلاح الدین نیر سے مختلف یونیورسٹیوں کے اسکالرس علمی و ادبی کاموں میں تعاون حاصل کرتے ہیں۔ گلبرگہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے ایک طالب علم نے "صلاح الدین نیر۔ حیات اور ادبی خدمات" کے زیر عنوان ایم فل کی ڈگری حاصل کی ہے صلاح الدین نیر گذشتہ ۱۵ سال سے اضلاع کے مشاعروں کے سلسلے میں ایک اہم اور قابلِ تحسین اقدام کر رہے ہیں۔ جب ہم نئے نئے شاعر تھے تو اُن دنوں اضلاع کے

مشاعروں میں منتظمینِ مشاعرہ کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ شعراء کے لئے جام و مینا کا انتظام کریں۔ لیکن جب سے صلاح الدین نیر کے تعاون سے اضلاع میں مشاعرے ہونے لگے ہیں، صلاح الدین نیر نے ان مشاعروں میں یہ اصلاح لائی کہ شراب کے بجائے شعراء کو معاوضہ دیا جائے، چنانچہ ہمارے ایسے ہم خیال شعراء جو ہمارے ساتھ مشاعرے پڑھتے ہیں، وہ شغلِ ساغر و مینا سے دور ہیں۔

صلاح الدین نیر ایک ایسا کامیاب شاعر ہے جس کی شاعری میں زندگی کی روشن علامتیں، اُجالوں کی سرزمین کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی شاعری میں اُجالوں کی تمنا، پیار، محبت کی پاسداری اور سر اُٹھاکر چلنے کا پیغام ملتا ہے۔ خوشبو کا سفر ہوکر رشتوں کی مہک، نیر کا سفر جاری ہے۔ نیر کی شاعری چونکہ دل کی شاعری ہے اس لئے دامنِ شعر و ادب میں نیر کا نام ایک گُلِ تازہ کی طرح، ہمیشہ مہکتا رہے گا۔ پتہ نہیں نیر میں قدرت نے وہ کون سی طاقت، حوصلہ اور صلاحیت عطا کی ہے کہ نیر زندگی کے ہر موڑ پر ایک تازہ دم سپہ سالار کی طرح نمودار ہوتے ہیں۔ جو شخص صبح کی اولین ساعتوں سے رات دیر گئے تک علمی و ادبی کاموں میں مصروف رہتا ہو اس کی تنظیمی صلاحیتوں کا بھی اعتراف شعبۂ حیات سے وابستہ حضرات کرتے ہی رہتے ہیں نیر ہمیشہ متحرک، فعال اور رواں دواں رہتے ہیں۔ جس شخص کی زندگی کا بیشتر حصہ علمی و ادبی اور تہذیبی خدمات میں گذرتا ہو اُس شخص کا نام لینا ہی ان محفلوں کے استحکام کے لئے کافی ہے۔

شخصیت کے تعین میں لوگ عمریں گذار دیتے ہیں لیکن نیر خوش نصیب ہیں کہ معاشرہ کا تقریباً ہر اہم شخص انکی عزت کرتا ہے، انکی صلاحیتوں کا معترف ہے۔

▬▬

رحمٰن جامی

صلاح الدین نیرؔ کی شعری و ادبی خدمات

صلاح الدین نیرؔ بنیادی طور پر زندگی کا شاعر ہے۔ نیرؔ کی شاعری میں زندگی کے سارے تقاضے اپنی پوری تابناکی کے ساتھ ملتے ہیں۔ نیرؔ کی شاعری میں رومانیت بڑے خوبصورت انداز میں در آئی ہے۔ اس رومانیت میں سستی اور بازاری قسم کی ہلکی سی اشاریت بھی نہیں ملے گی بلکہ نیرؔ کی رومانیت میں پاکیزگی اور شائستگی جابجا اپنا جلوہ دکھاتی ہوئی نظر آئے گی۔ نیرؔ کی شاعری میں انسان دوستی اور دردمندی اپنی تمام تر دل پذیری کے ساتھ موجود ہے۔ نیرؔ نے کہیں کہیں اساتذہ کی تقلید بھی کی ہے لیکن اس روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کو بڑی چابکدستی اور فنی مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

صلاح الدین نیرؔ کی تنظیمی صلاحیتوں کا لوہا ہر وہ شخص مانتا ہے جو نیرؔ کو قریب سے جانتا ہے۔ سکریٹریٹ کی اردو اسوسی ایشن سے لے کر انجمن ترقی پسند مصنفین تک حیدرآباد کی کم و بیش درجن بھر انجمنوں سے وابستگی اور ان کا کامیاب انصرام و انتظام اور ان کی برجستہ برموقع اور مستقل کارکردگی صلاح الدین نیرؔ کی مرہونِ منت ہے جن میں محفلِ خواتین بھی شامل ہے۔

نیر کی ادبی سرگرمیوں میں مختلف ادبی انجمنوں کی سرپرستی اور وابستگی کے علاوہ مشاعرہ برپا کرنا اور مشاعرہ برپا کروانا بھی شامل ہے۔ چنانچہ حیدرآباد کا کوئی بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا مشاعرہ صلاح الدین نیر سے تعاون حاصل کرتا ہے۔ جن میں ادبی ٹرسٹ اور شنکرجی میموریل سوسائٹی مشاعرہ کے علاوہ کل ہند مجلس اتحاد المسلمین دارالسلام کا سالانہ نعتیہ مشاعرہ بھی شامل ہے۔ اس سے ہٹ کر ان کی ادبی سرگرمیوں میں دوستوں کی کتابوں کی اشاعت میں اپنے بیش بہا مشوروں کے ساتھ بنفس نفیس اپنے آپ کو بھی اس کے کام کے لئے وقف کر دینا بالکل اسی طرح جس طرح خود صلاح الدین نیر کی اپنی کتاب شائع ہوتے جارہی ہو، چنانچہ کئی کتابیں خود مدون اور مرتب کیں اور شائع کروائیں (ان کی کتابت سے لیکر طباعت اور دیگر مراحل میں سرتاپا پیش پیش رہ کر اس کو پہنچانے تک نیر چین سے نہیں بیٹھ سکتے) مختلف رسائل کی ادارت میں بھی ان کی شمولیت پرچہ کی کامیاب مسلسل اجرائی کی ضامن سمجھی جاتی ہے۔

صلاح الدین نیر کے بغیر کوئی مشاعرہ کامیاب اور مکمل نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ مشاعرہ ہمیشہ کامیاب رہتا ہے جس کے معتمد یا ناظم مشاعرہ نیر ہوتے ہیں۔ حیدرآباد سے باہر کے مشاعروں میں حیدرآبادی شاعروں کو لانے اور لے جانے کی تمام تر ذمہ داری صلاح الدین نیر کے سپرد ہوتی ہے۔ مجھے نیر کے ساتھ ان گنت مشاعرے پڑھنے کا اتفاق ہوا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ نیر کے اصرار کی وجہ سے بالخصوص اضلاع کے مشاعروں میں شریک رہنا پڑا۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ نیر جیسا باسلیقہ مہتمم اور منتظم میں نے کسی اور کو نہیں دیکھا۔ اس کے علاوہ میں نے دوران سفر نیر کو

ہمیشہ ہمدرد اور خیال رکھنے والا ساتھی پایا۔ نہ صرف یہ کہ وہ مخلص دوست ثابت ہوا
بلکہ ایماندار محاسب بھی پایا ہے۔ نیّر پر ادبی اور تنظیمی معاملات پر بھروسہ کیا
جا سکتا ہے بلکہ میرے نزدیک وہ انتظامیہ بے حد خوش نصیب ہے جس کو صلاح الدین نیّر
کا تعاون حاصل ہے۔ صلاح الدین نیّر کی شخصیت کے بارے میں میری رائے یہ
ہے کہ صلاح الدین نیّر ایک نہایت مخلص، ہمدرد اور باعتماد دوست۔ خود تکلیف
اُٹھا کر دوستوں کو راحت اور آرام پہنچانے والا ساتھی اور فائدہ پہونچانے والا [illegible]
دیرینہ ہے۔ میں نے صلاح الدین نیّر کو ہمیشہ اپنا بے لوث دوست پایا۔

صلاح الدین نیّر کی ادبی ٹرسٹ اور شنکرجی مشاعروں کے لئے لازم و ملزوم
کی حیثیت ہے۔ بہ قول عابد علی خاں مدیر سیاست۔

"وہ (صلاح الدین نیّر) تنہا میرے معاون ہیں۔ ان کی زندگی کا
بڑا حصہ شعر و ادب کی خدمت میں گزرتا ہے اور ان کی صبح
سیاست سے شروع ہوکر شام یہیں ختم ہوتی ہے۔"

اوروں کی بات تو میں نہیں جانتا، البتہ میری نظر میں صلاح الدین نیّر دکن کا وہ کوہ نور
ہے جس کی چمک ہند و پاک کے علاوہ دیگر اردو دنیا کے شعر و ادب کی نظر کو خیرہ
کئے ہوئے ہے۔ چشم بد دور۔

جہاں تک مجھے مختلف جلسوں اور تقریبات میں صلاح الدین نیّر کے بارے
میں حکومت کے سربراہوں کے خیالات جاننے کا اتفاق ہوا، جن میں مختلف ڈپارٹمنٹ
کے سکریٹریوں، چیف سکریٹریوں، وزیروں، چیف منسٹروں اور گورنروں کی رائے بھی
شامل ہے وہ یہ ہے کہ صلاح الدین نیّر دکن کا وہ ممتاز و منفرد شاعر ہے جس کی

نمائندگی اور رسائی اعلیٰ سے اعلیٰ مقام تک ہے جو اُردو والوں کے لئے باعثِ فخر و منزلت ہے۔ صلاح الدین نیّر کی مقبولیت کی وجوہات میں میرے نزدیک سب سے بیّن وجہ نیّر کی انتھک محنت و جستجو اور اپنے فن سے بے انتہا لگن اور خلوص اور ایک اہم بات یہ ہے کہ نیّر کو اپنی ذات پر بھروسہ اور اپنے آپ پر کامل اعتماد ہے اور اس کے علاوہ مسلسل کام اور اپنے آپ سے پیار نیّر کی کامیابی اور مقبولیت کا راز ہے جو نہ صرف نیّر کو مقبول و ممتاز بنائے ہوئے ہے بلکہ صحت مند و جوان رکھے ہوئے ہے۔

نیّر کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اُردو، ہندی اور تلگو شعراء کو اکثر و بیشتر ایک اسٹیج پر جمع کرتے رہتے ہیں اور ایسے کئی لسانی مشاعروں میں نیّر نے مجھے گھسیٹا ہے اور میں ان مشاعروں کی کامیابی کا چشم دید گواہ ہوں۔ نیّر کی مقبولیت کا راز یہی ہے کہ نیّر مزاجاً ہرنجاں مرنج، سیدھا سادا، مخلص اور بے لوث ہونے کے علاوہ حیدرآبادی تہذیب و تمدن کا جیتا جاگتا نمونہ اور اخلاق و آداب، شرافت کا مجسم پیکر اور دکن کی روایات کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے شمالی ہند کے مشاعروں میں بھی بے حد مقبول ہے۔

(ایک انٹرویو سے اقتباس)

کنھیال سنگھ ورما

صدر شعبہ ہندی انوار العلوم کالج

دوستی کا رشتہ

ایک اچھے شاعر اور ایک اچھے انسان کو ایک ہی شخصیت میں ڈھونڈنے کی کوشش میں ہم اکثر مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ صلاح الدین نیر سے جب میری ملاقاتیں دوستی کے دائرے میں قید ہونے لگیں اور ہم دوستوں کے حدود میں بندھ گئے۔ تب میں نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ معلوم کروں کہ صلاح الدین نیر ایک اچھے انسان ہیں یا نہیں۔ میری دوستی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ایک اچھے انسان اور ایک اچھے شاعر ہیں، ورنہ دوستی کے کچے دھاگے ہم دونوں کو اتنی مدت تک باندھ کر نہیں رکھ سکتے۔ میری کئی شعراء سے دوستی بڑھی لیکن ایک مقام ایسا بھی آیا جہاں پتہ چلا کہ وہ شاعر یا کوی تو ہے مگر دوستی کے لئے ایک اچھا انسان نہیں ہے۔

میرے دوست صلاح الدین نیر اور میرا دوستی کا رشتہ ایک ہے جس نے انسانی زندگیوں کی بلندیوں اور پستیوں میں ہم دونوں کو شریک رکھا۔ اس دوستی کے رشتے نے اپنی پہچان کا ایک احساس مجھے دلایا ہے اور دلاتا رہے گا۔ ہم لوگ

مشاعروں میں کلام پڑھتے رہے ہیں۔ اُردو شاعر اور ہندی شاعر کی اِس دوستی نے اُردو اور ہندی زبانوں کو قریب لانے کی کامیابی کا سہرا اپنے سر تو باندھا ہی ہے مگر ادبی دنیا میں ایک ایسا ماحول بھی بناتے میں کامیابی حاصل کی ہے جہاں امن، سکون، پیار محبت کے نغمے گونج رہے ہیں۔ جب ملک میں بدترین فسادات ہوئے۔ انسانیت کانپ اُٹھی۔ ہماری دوستی نے انسانی قدروں اور جذبات سے مخمور ہو کر انسانیت کی بقاء اور امن کے لئے آواز لگائی۔ ہمارے قلم نے خون کے آنسو بہاتے ہوئے خون کی ندیوں کو پار کیا۔ جلے ہوئے محلوں اور اُجڑی ہوئی بستیوں کے بیچ ہم نے اپنا سفر جاری رکھا۔ غم کے مارے ہوئے انسانوں نے ہمارے قلم کے پیام کو اپنی زندگی کی نئی کرن اور نئی آس سمجھا اور پھر بجھتا ہوا چراغ دھیرے دھیرے زندگی کی روشنی کے ساتھ جگمگانے لگا۔ یہی ہماری دوستی کی بنیاد اور یہی ہماری زندگی کا پیام ہے۔

صلاح الدین نیّر کی نظموں میں مجھے وہ احساسات ملے جو رشتوں کی مہک دیتے ہیں۔ ہر نظم کسی نہ کسی واقعے اور جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ اِن نظموں میں اُجالے اور اندھیرے کے ٹکراؤ کے مناظر بڑی خوبصورتی کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے نمودار ہوتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر سماج اور معاشرہ سے ٹکراتا رہا ہے۔ جنونانہ عشق کے بجائے ان نظموں میں ایک حقیقت پسند انسان کی وہ جستجو ہے جہاں وہ خلاؤں میں بھٹکنے کے بجائے زندگی کو میدانِ عمل سمجھتا ہے۔ ان کی نظمیں خیالی یا قیاسی نہیں ہیں بلکہ زندگی کی روشن اور تعمیری اقدار کی ترجمان ہیں۔ ایسی نظمیں وہی شاعر لکھ سکتا ہے جس کی آنکھیں کھُلی ہوئی ہوں اور جو ہر واقعہ کو گہرائی سے دیکھتا ہو۔ اِس تجربہ کے لئے ایک ہمدرد دل اور جذبے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بیشتر شعراء کے

پاس احساسات تو ہوتے ہیں مگر یہ احساسات ان کے اپنے احساسات ہوتے ہیں۔ ان کی اپنی محبت اور اس کی کامیابی یا ناکامی کی گرمی ہوتی ہے۔ وہ حرارت نہیں ہوتی جو دوسروں کی زندگی کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ شاعر ٹھوس زمین پر کھڑا رہے اور حقیقت کو مدِ نظر رکھ کر حالات کا جائزہ لے۔ ایسی حالت میں اُس کی اپنی زندگی پس منظر میں چلی جاتی ہے اور انسانی زندگیوں کے مناظر اُس کی شاعری کا مرکز ہو جاتے ہیں۔ وہ خود سے اوپر اُٹھتا ہے اور خاندان، قبیلہ، صوبہ اور ملک کی دیواروں کو پھاند کر ساری دنیا کے انسانوں کو اپنا بھائی سمجھنے لگتا ہے اور یہیں سے وہ شاعری جنم لیتی ہے جو سورج کے اُجالوں اور چاند کی چاندنی سے چمک اُٹھتی ہے۔ اس کے کلام میں آنسو، قہقہے، غم، خوشی سب برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ جس طرح ساری دنیا کے انسانوں کے جذبات ایک ہوتے ہیں، اسی طرح ساری دنیا کے انسانوں کے لئے شاعری بھی ایک ہوتی ہے۔ زبان کبھی جذبات کو جدا کرنے کا ذریعہ نہیں ہوتی بلکہ زبان دنیا کے انسانوں کو جوڑنے کا سبب ہوتی ہے۔

اُردو شاعر صلاح الدین نیّر نے بھی اُردو زبان کے ذریعہ ساری دنیا کے انسانوں کے جذبات کو اپنے قلم کی نوک سے کاغذ پر بکھیرا ہے۔ اس سیاہی میں نیّر کی آنکھوں کے وہ آنسو بھی ہیں جو جنگ اور فسادات کی تباہی پر نکلے۔ ان میں وہ خوشی کے آنسو بھی ہیں جو خوشی کے موقعوں پر انسانوں کے ناچ، گانے، موسیقی کے ذریعے بہے ہیں۔ یہاں شاعر کا جذبہ شخصی نہ ہو کر ساری انسانی برادری کا جذبہ ہو گیا ہے۔

صلاح الدین نیّر کی کوششوں سے حیدرآباد میں بے شمار شعری محفلوں کا انعقاد عمل میں آیا۔ ہر مشاعرے میں ان کی کوشش رہی کہ اُردو کے ساتھ ہندی اور تلگو کے شعراء بھی حصہ لیں۔ ان کی کوشش رہی کہ ہندی، اُردو قریب آئیں۔ اُردو اور ہندی دو بہنیں ہیں اور رسم الخط کی دیوار بیچ میں نہ ہو تو قاری کو دونوں زبانوں کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ میں نے ان کی ہر کوشش میں ساتھ دیا ہے اور میں نے جب یہی کوشش ہندی کے پلیٹ فارم سے کی تو نیّر صاحب میرے شانہ بہ شانہ قدم ملا کر چلتے رہے۔ حیدرآباد کی تہذیب کو گنگا جمنی تہذیب کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ گنگا جمنی تہذیب یہاں کے گلی کوچوں میں دکھائی دیتی ہے، آپسی تعلقات میں دکھائی دیتی ہے۔ عیدوں اور تیوہاروں میں دکھائی دیتی ہے۔ اسی گنگا جمنی تہذیب کو مشاعروں کے ذریعہ سارے ہندوستان کے سامنے پیش کرنے کی کوشش ہماری رہی ہے۔ ان کوششوں میں جو کامیابی حاصل ہوتی ہے اس سے اُمید ہے کہ یہ کوشش ملک کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔

--

ڈاکٹر عقیل ہاشمی

زخموں کے گلاب

"زخموں کے گلاب" حیدرآباد کے ایک جانے پہچانے شاعر صلاح الدین نیّر کی تخیلات کا آئینہ دار ہے۔ یہ اُن کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ اپنے عنوان ہی سے شاعر کے جذبات و احساسات کی نمائندگی کرتا ہے۔ شہنشاہِ غزل جگر مرادآبادی نے کبھی کہا تھا۔

شعر کے پردے میں پوشیدہ ہے ساری کائنات
شعر سے بڑھ کر نہیں ہے کوئی تفسیرِ حیات

اِس شعر کی روشنی میں کائنات اور حیات کا ایک عکس اور وہ بھی عکسِ جمیل ہم کو "زخموں کے گلاب" میں نظر آتا ہے۔ "زخموں کے گلاب" کی مہک جہاں ذہنی آسودگی و شگفتگی سے بہرہ مند کرتی ہے وہاں مسائل اور وہ بھی انسانی سرشت کی مختلف تحریکات سے وابستہ کرتی ہے۔ شاعر کے فن کا کمال اُس کے جذبات کی ہم آہنگی، الفاظ کا رکھ رکھاؤ، شعور و ادراک، مشاہدہ کی پختگی سے کیونکر نمایاں نہ ہوگی جب کہ وہ اپنے سینے میں ایک حساس دل رکھتا ہے۔ نیّر کی شاعری بھی اپنے کچھ خاص قدریں متعین کر چکی ہے۔ جامی اور مخدوم کے شہرِ نگاراں

کا یہ شاعر اپنے مخصوص لب و لہجہ سے کافی متاثر کرتا ہے۔ نیئر کے اس دوسرے مجموعۂ کلام کو خود انہوں نے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ حکایتِ گُل، زخمِ گُل اور حدیثِ گُل، مگر ان تین مختلف حصص میں جذبات و احساسات کی فراوانی ایک ہی ملے گی۔ حکایتِ گُل کا حصہ جو خالص غزلیات پر مشتمل ہے اپنے بیان اور اظہار میں ندرت و چاشنی کے ساتھ ساتھ جدید غزل سے مماثلت رکھتا ہے۔ وہ کسی بھی ازم سے منسلک و مربوط ہو کر اپنی شخصیت کی ہمہ گیری کو متاثر کرنا نہیں چاہتا۔ جب کہ نیئر کے کلام کی توضیح و تشریح ترقی پسندانہ انداز میں بھی کی جا سکتی ہے آج ساری دنیا جانتی ہے کہ ادب میں ترقی پسندی کا عنصر ایک جزوِ اعظم کی حیثیت سے جدا نہیں۔ بقول پروفیسر احتشام حسین (جنھوں نے اس کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے) اکثر لوگوں نے ذہنی رویے اور غیر سماجی اندازِ فکر پر پردہ ڈالنے کیلئے تاریخی حقائق کا مذاق اڑانے سے گریز نہیں کیا جبکہ ترقی پسندی کے بنیادی پہلو سے انحراف ناممکن ہے۔ جہاں تک شعور کی پختگی اور تہذیبِ نفس کی شائستگی اور احساسِ دروں کا سوال ہے نیئر کے یہاں جگر اور مخدوم کی چھاپ ضرور ملتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ کچھ لوگ چٹانوں سے گرے ہیں   میں بھی تو پہاڑوں کی طرح ٹوٹ رہا ہوں

آرائشِ گلشن کی گھڑی جب کبھی آئی   پھولوں کے مقابل رہا تھا دلِ ویراں

نیئر کے کلام کے دوسرے حصے 'زخمِ گُل' میں موضوعات کی فراوانی ملتی ہے۔ یہ موضوعات پہلے بھی استعمال کئے جا چکے ہیں تاہم اپنے رنگ و آہنگ کی وجہ سے عصرِ حاضر اور اس کے گرد و پیش کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔

بجز خلوص ہر اک جنس ہو گئی ارزاں ۔ جہاں بھی جاؤ رفیقو! زمانہ سازی ہے

ضرورت اس امر کی تھی کہ جدید شعری جدو جہد، طرزِ بیان کی آبیاری کی جاتی جو شاعر کو مہتم بالشان کیفیت سے دوچار کرتی مگر نیّر تجربات سے دامن بچاتے ہوئے مطالعہ اور مشاہدے کی قوت سے کام لیتے نظر آتے ہیں اور اس میں بڑی حد تک وہ کامیاب بھی ہیں۔

کتاب کے تیسرے حصے کا تعلق حسن و عشق کی معاملہ بندی، جذبات و احساسات کی نازک خیالی، خوشگوار و تلخ حقیقتوں کا حسین امتزاج، شعلہ و شبنم والی حسیت، سوز و ساز کی کیفیت سے دامن گیر ہے۔ اس میں شعور و ادراک کا برتاؤ کہیں بھی متجاوز نہیں۔ نیّر کسی قسم کی کوشش کئے بغیر اپنی نغماتی وابستگی سے بہت جلد روشناس ہو جاتے ہیں۔ اشعار کی ظاہری دل آویزی، احساس کی شدت، سامع و قاری کے قلب و ذہن پر راست اثر کرتی ہے۔ وہ ان اشعار کی ترنم ریزیوں میں یک گونہ کیف و لذت پاتا ہے یا یوں کہیئے کہ عالمِ خود فراموشی کے ساتھ ساتھ واقعیت کا پتہ بھی چلتا ہے۔

کیا کیا نہ سوچ رکھا تھا کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ کیا بات تھی کہ لب نہ ہلے اُن کے روبرو

اِس سے پہلے کبھی میں نے تمہیں دیکھا تو نہیں۔ پھر بھی لگتا ہے کہ برسوں سے شناسائی ہے

ان کی نظموں میں خواہ وہ موضوعاتی ہوں یا رومانی، واقعات کا تسلسل خمار آگیں ہونے کے علاوہ تجسس اور پیش رفت کا رجحان لئے ہوئے ہوتا ہے۔ رومانی نظموں میں یاس و محرومی کا پہلو بھی نمایاں ہے، گو کہ ان میں طنز کا قرینہ نہیں ملتا لیکن قاری یا سامع غمِ دوراں، غمِ پنہاں یا غمِ جاناں کے زینے پا جاتا ہے۔

آسودگیٔ تشنہ لبی کس کو ملی ہے ۔ صدیوں سے جو پیاسا ہے وہ پیاسا ہی رہا ہے

نیّر دنیا کی سرد و گرم، سیاسی محرکات یا سماجی واقعات سے خوب آگاہ ہیں۔ جدید یا عصری شعور کے تقاضے اُن کا استعمال، ادراک کی پختگی، نئی اور پرانی علامتوں کا امتزاج اُن کا اظہار سبھی کچھ نیّر کی شاعری میں مل جاتا ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ نیّر کے ہاں اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ اپنی شاعری کو نت نئے ادبی تجربات کے نذر کر دے۔ اسی وجہ سے اکثر جگہوں پر اُن کی طبیعت کی شادابی کھُل کر سامنے آتی یا پھر وہ مسائل کی گتھیوں میں کھو کر رہ جاتے ہیں۔ زخموں کے گلاب کا مطالعہ اگر ایک طرف آپ کو جگر و فراق جیسے غزل گو شعراء کی یاد دلاتا ہے تو دوسرے ہی لمحے جاتی و مخدوم کی بھی یاد دلاتا ہے۔ یقین ہے کہ یہی ایک مخصوص تازگی و انفرادیت نیّر کو اپنا ایک مقام بنانے میں بڑی حد تک مدد دے گی ۔

ہاتھوں میں لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے
ہوگا وہی جو آپ کے ماتھے پہ لکھا ہے

(زخموں کے گلاب ۔ ۸ جولائی ۱۹۷۳ء)

وقار خلیل

زخموں کے گلاب - شکن در شکن

۱۹۷۲ء کی پہلی سہ ماہی میں کئی اچھے شعری مجموعے شائع ہوئے۔ ان میں "زخموں کے گلاب" بھی شامل ہے۔ صلاح الدین نیّر حیدرآباد کے جواں سال اور صحت مند فکرِ سخن کے شاعر اور اُردو زبان و ادب کی خدمت میں رضاکارانہ طور پر حصہ لینے والے مخلص اور دردمند نوجوان ہیں۔ اس سے پہلے ۱۹۶۵ء میں ان کا پہلا مجموعہ "گلِ تازہ" شائع ہوا تھا اور پھر اُسی سال تلگو میں غزلیہ شاعری کا ایک انتخاب بھی "نیّر گیتالو" کے نام سے نکلا تھا۔

"زخموں کے گلاب" کا پیش لفظ ہمارے عہد کے صفِ اول کے عظیم نقاد پروفیسر سید احتشام حسین نے تحریر کیا ہے۔ نیّر کی غزلیہ شاعری کے صحت مند رجحان کو سراہتے ہوئے موصوف نے ان کی نظم نگاری کے بارے میں لکھا ہے کہ "فن سے وابستگی اور تجربات کو شاعرانہ نظر سے دیکھنے کے فیض کے سبب ان کی نظموں میں انسانی قدروں سے محبت کے پہلو ملتے ہیں اور بہت سے نئے شاعروں کے برعکس وہ جرأت رکھتے ہیں کہ قاتل و مقتول اور ظالم و مظلوم میں تمیز کر سکیں۔"

نیّر کے اس مجموعے کو پڑھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر رومان

کے شاعر ہیں۔ اُن کی پوری شاعری میں چاہے وہ غزلیہ ہو کہ نظم کی، محبت اور ایک ستھری محبت کے نم دیدہ اور چاہے جانے والے جذبات ملتے ہیں۔ لطیف احساسات کے حامل مہکتے ہوئے خیالات ان کی غزلوں اور رومانی نظموں کے پیکر ہیں بہار اور اخلاص کی خوشبو کے ساتھ تہذیب اور تمدن کی روشنی اور کہیں کہیں حرارت بھی ملتی ہے اور متاثر کرتی ہے۔ نیّر نے ایک لہجہ بنا لیا ہے۔ کلاسیکی قدروں کے ساتھ ساتھ ترقی پسند' اندازِ فکر نے ان کے کلام کو عصری حیثیت سے آشنا کر دیا ہے۔ فکر اور شخصیت میں وہی مٹھاس، وہی شائستگی وہی رس جس ملتا ہے جس سے نیّر عبارت ہے۔ اپنی شخصیت اور فکر و فن کے بارے میں نیّر نے بڑی کشادہ دلی سے چند صفحات لکھے ہیں اور اپنے شعری رویہ کی وضاحت بھی کی ہے جس کے مطالعہ سے بڑی حد تک ان کی شاعری کا مزاج سمجھ میں آجاتا ہے اور ذہن و فکر کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔

"نشاطِ غم" کو نیّر نے مختلف طریقوں سے برتنے اور متاثر کرنے کی کوشش کی ہے اور اِس سعی و کاوش میں انسانی رشتوں کا احترام کو بھی انہوں نے ملحوظ رکھا ہے۔ قومی اور ملّی شعور کے ساتھ ساتھ تہذیبی، زمینی اور جسمانی قدروں کا عرفان بھی نیّر کے ہاں ملتا ہے۔ کون قاتل ہے اور گاندھی ازم کے علاوہ ڈاکٹر زور اور مخدوم محی الدین پر جو نظمیں شامل ہیں وہ پسند آئیں۔ ان کی رومانی نظموں کے یہ چند عنوانات ہیں۔ بھیگی پلکیں، تشنہ لبی، وعدہ، موتیا کے پھول، کاجل، چوڑیاں، خطوط، پھول زخمی ہیں، عمر بھر کے رشتے اور پھر کب آؤ گے۔ اِن تانے بانے سے جو فضا بنتی ہے اور جو مزاج کریئٹ ہوتا ہے اُس کی پوری مہک، لطافت، تازگی اور جمالیاتی شعور کی شیشہ گری اور ان کے عکس اور رنگ مجموعی طور پر دھڑکتے اور مہکتے نوخیز

دلوں کو متاثر کرتے ہیں۔ نیّر کی غزلوں کے یہ چند شعر جو بے حد اچھے لگے ملاحظہ کیجئے :-

شعورِ غم بھی اگر تم چھین لو گے ۔ ہماری زندگی میں کیا رہے گا

عجیب بات ہے دورِ جدید کا انساں ۔ نہ دوستی کے لئے ہے نہ دشمنی کے لئے

احساس بھی زخمی ہے تمنائیں بھی زخمی ۔ یہ تم نے کہاں لاکے مجھے چھوڑ دیا ہے

برگِ آوارہ کی مانند ہے تنہا تنہا ۔ زندگی ساتھ مرا چھوڑ کے پچھتائی ہے

اتنے لگے ہیں زخم کہ دل بولتا نہیں ۔ آئینہ اپنا بھید کبھی کھولتا نہیں

نیّر! شعورِ غم کا سلیقہ اگر نہ ہو ۔ دل کے معاملات کو رسوا نہ کیجئے

(زخموں کے گلاب۔ تبصرہ "حیات" دہلی

(۱۹۷۳ء)

○

• حیدرآباد شعر و ادب، تہذیب، رواداری کا جیتا جاگتا نمونہ رہا ہے۔ یہاں آپسی میل ملاپ کی فضا بنی رہی ہے۔ وقتی مصلحتوں نے شہر کے امن و امان کو متاثر ضرور کیا مگر دلوں میں پیار اور محبت کا چراغ روشن ہی رہا۔ مشرقی تہذیب اور گنگا جمنی کلچر کے اس شہر آرزو کی شعری محفلوں میں بہت سوں نے ایک دُبلے پتلے گندمی رنگ، شیروانی میں ملبوس شاعر کو بیٹھے اور سبک ترنم میں ڈوب کر غزل سناتے دیکھا ہے۔ واہ واہ کی ہے اور فرمائش کر کے کلام سُنا ہے اُس شاعر کا نام صلاح الدین نیّر ہے۔ جس کے اب تک تین شعری مجموعے

"گل تازہ" (۱۹۶۵) "زخموں کے گلاب" (۱۹۷۳) اور "صنم تراش" (۱۹۷۸) چھپ کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ تلگو میں ایک انتخاب کھم کے اردو دوست نے "نیر کویتا لو" کے نام سے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔ تلگو شاعری کا ذوق رکھنے والوں نے اردو کے اس خوش فکر شاعر کے خیالات سے کیف حاصل کیا ہے۔

'شکن در شکن' صلاح الدین نیر کا چوتھا شعری انتخاب ہے۔ نیر حیدرآباد کی علمی، ادبی اور کلچرل مصروفیات میں نمایاں اور حرکی شخصیت کا ایک نام ہے۔ شرافت، خلوص اور دردمندی کی ایک روشن علامت ہے۔ نیر ویسے تو ریاستی دفاتر معتمدین میں پنچایت راج محکمہ کے سکشن آفیسر ہیں مگر صبح سے رات دیر گئے تک علمی، ادبی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔

صلاح الدین نیر 'روایت اور عصری شعور' زندگی کی بدلتی قدروں کے رمز شناس شاعر ہیں۔ محبت اور انسانیت کی مہک سے ان کا شعور عبارت ہے۔ نیر نے غزل کی زبان میں تہذیبوں کے ڈوبنے اور جھلملانے کے کرب کو دل نشیں پیرائے میں بیان کرنے کی سعی مشکور کی ہے۔ آزاد اور پابند نظموں میں محبت کے رموز، خون اور زمین کے رشتوں کی تقدیس کو ظاہر کیا ہے۔ اپنے انداز میں اپنی بات کہنے کا سلیقہ آ گیا ہے۔ نیر کی شاعری میں شورِ سلاسل اور پائل کی صدا ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔

صلاح الدین نیر کا یہ نگار خانہ شعر کئی جہتوں سے ان کی ستھری، سادہ اور متاثر کرنے والی فکر کا مظہر ہے۔ گل پیرہن رتوں میں شکن در شکن حالات سے اثر قبول کرنے والا یہ شاعر اپنی واردات کو پانچ حصوں میں بیان کرتا ہے۔ پہلا حصہ

عقیدت کے پھول سے عبارت ہے۔ نعت اور منقبتوں کے مظہر اوراق مالک نیر کا جذبۂ عقیدت سرشاری کی کیفیت کا مظہر نظر آتا ہے۔

رسول پاکؐ سے اُس کی اٹوٹ عقیدت، یہ بتاتی ہے کہ وہ اسلامی اقدار کا پاسدار اور دردمند دل رکھنے والا مردِ مومن بھی ہے۔ چند نعتیہ شعر ملاحظہ ہوں۔
رسولِ پاکؐ کی سیرت کا ایک بھی لمحہ — کھُلی کتاب ہے تجدیدِ آگہی کے لئے
یہ واقعہ ہے کہ نسبت بڑا سہارا ہے — ہجومِ غم میں گنہ گار آدمی کے لئے
پڑا ہے مجھ پہ دل والوں کا سایہ — میں اب تک روشنی کا سلسلہ ہوں

۳۷ آزاد نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں جن کی مہک سے کیف حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس باب کی بیشتر نظموں میں نیئر کا رومانی شعور مہکتا نظر آتا ہے۔ لمس اور احساسِ بدن کا یہ آبگینہ صہبائے کیف و نشاط کی منزلوں کو چھوتا محسوس ہوتا ہے۔ 'کہاں کہاں نہ گیا' 'وہ لڑکی' 'تنہائی' 'مصلحت' 'جہاں کہیں بھی رہو' اس حصہ کی وہ نظمیں ہیں جن میں نیا ذہن بار بار پڑھ کر لطف لے سکتا ہے۔ گھُٹے گھُٹے اور تلخ ماحول میں کیف و انبساط سے معمور ایک جھونکا بھی غنیمت ہوتا ہے۔ ایک نظم 'وہ لڑکی' نیئر کے مظہر احساسات اور معصومانہ جذبات کی اچھی مثال ہے۔ اختصار میں کمالِ حُسن اس نظم کا وصف ہے۔ ملاحظہ ہو۔

وہ لڑکی جب کبھی آتی ہے مجھ سے ملنے کو
میں اپنے پاس بڑے پیار سے بٹھاتا ہوں
وہ اپنے نرم ملائم لبوں کی جنبش سے

تمہارے حُسن کا سو طرح ذکر کرتی ہے
پھر اُسکی آنکھوں میں، میں تم کو دیکھ لیتا ہوں
یہ بھول جاتا ہوں میں آج بھی اکیلا ہوں

'دستک' کے زیر عنوان '۳۴' نظمیں شائع ہوئی ہیں، جن کا افق 'قوم وطن'، تہذیب اور ملک کی توقیر سے عبارت خیالات ہیں۔ اِن نظموں میں شاعر اپنے ملک سے محبت کرتا ہوا ملتا ہے۔ اصولوں سے ٹوٹ کر نباہ کرنے کے جذبات کو آئینہ دکھاتا ہے۔ وہ ویت نام اور فلسطین کے حریت پسند جیالوں کے شانہ بشانہ نظر آتا ہے۔ اندھیروں میں چراغاں بہ کف ملتا ہے۔ حیدرآباد کو 'شہرِ آرزو' لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ "یہاں کے ذرے ذرے میں محبت ہی محبت ہے۔"
طوفانِ بادو باراں کے غمزدوں کی یاد میں نم دیدہ نظر آتا ہے اور "لاشوں کا شہر" ایسی نظم لکھ کر غم ہلکا کرتا ہے۔ 'عید' کو فکر کا موضوع بنا کر مسرتوں میں گم نہیں ہوتا بلکہ یہ کہنے پر مجبور نظر آتا ہے کہ

عید اُن کی ہے جو ہر حال میں جی لیتے ہیں
چاک جتنے بھی گریبان ہوں سی لیتے ہیں

یادِ رفتگان کے باب میں نیر نے ۷ نظمیں لکھی ہیں اور ہر نظم خراجِ عقیدت کا تاثر چھوڑتی ہے۔

صلاح الدین نیر کے شعری مجموعہ شکن در شکن کا آخری حصہ "پیراہن گل" ہے جس میں ۱۴۴ غزلیں ہیں اور یہ حصہ دیگر تمام حصوں سے کہیں زیادہ تازہ کار شگفتہ اور لطیف ہے۔ نیر غزل کے شاعر ہیں اور غزلیہ شاعری میں بڑی تیزی

سے ارتقاء کی طرف رواں دواں ہیں۔ خود شناسی کے عرفان کے ساتھ۔

چند شعر ملاحظہ ہوں۔

جنوں کی مُہر لگی ہو تو ہم بھی پی لیں گے - یہاں یہ زہر سے خالی کوئی گلاس نہیں

خوں بہا مانگنا چاہیں بھی تو کس سے مانگیں - شہر کا شہر ہے قاتل کے طرفداروں میں

تمام عمر کٹی اپنی وضعداری میں - انا تو صرف فقیروں کے گھر میں رہتی ہے

قلندروں ہی کی محفل میں مل گئی نیّر - وہ اک خوشی جو غمِ معتبر میں رہتی ہے

ہیں خاک نشینوں کو بھی یاد آؤں کا نیّر - جب تک مرے احساس میں آشفتہ سری ہے

نیّر کی غزلوں میں شرافتِ فن اور وضعداریِ سخن کے ساتھ آشفتہ سری اور غمِ معتبری کی چمک دمک اضطرابِ مسلسل کی جدوجہد اور سمندروں کو پی لینے کی پیاس ظاہر کرتی ہے کہ وہ اپنے خیالات کو آبگینۂ غزل کے پیمانے میں جرعہ جرعہ روشن کرتے رہتے ہیں۔

(تشکن در تشکن۔ تبصرہ "منصف" اقتباس۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۷۹ء)

ششی نرائن سواد تھین

زندگی کے آئینے میں "سلسلہ پھولوں کا"

"سلسلہ پھولوں کا" نامور شاعر جناب صلاح الدین نیّر کی خود نوشت ہے۔ صلاح الدین نیّر کا نام اُردو ادب کا ایک جانا مانا معتبر نام ہے۔ نیّر وہ شاعر ہے جس نے سرزمینِ دکن کا نام سارے ہندوستان میں اونچا کیا ہے۔ نازک احساسات کے شاعر صلاح الدین نیّر کی زندگی کے پھولوں کا یہ سلسلہ اپنے آپ میں اُن خوبصورت لمحوں، واقعات اور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب سے جُڑی شاعرانہ زندگی کے شوخ رنگوں کا اظہار ہے جو اِس قد آور شاعر کی زندگی میں احساسات کی شکل میں وقفہ وقفہ سے پھولوں کا سلسلہ بُنتے رہے ہیں۔

نیّر نے اپنی اس خود نوشت میں زندگی کے اُتار چڑھاؤ، وقت کے بدلتے سماجی تقاضوں کے ساتھ ساتھ احساسات کی دنیا میں جیئے گئے عمر کے طویل حصّے کو جس طرح اُس نے جیا ہے اُسی طرح لکھ بھی دیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ شاعر کی تحریر اور شخصیت میں کوئی اختلافی لکیر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خود نوشت ہمیں ناول کا لطف دیتی ہے۔

نیّر نے اپنی اِس خود نوشت میں اُن سنہرے اوراق کو بھی اُلٹا ہے

جو دلچسپ اور تحریک کے سرچشمہ ہیں۔ پہلے باب میں "سرچشمۂ فیضان" اور گھر آنگن میں بتایا ہے کہ ہمنا آباد' بیدر کی مٹی سے وابستہ اپنی پیدائش کی کہانی بڑے ہی خوبصورت انداز میں بیان کی ہے۔ اُن کا خاندان زمیندار اور تجارتی طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ نیّر کا بچپن بڑے ہی احتیاط اور مکمل ڈسپلن میں گزرا سرپرست اُنھیں اپنی نظروں سے اوجھل ہونے نہیں دیتے تھے۔ اس ڈسپلن میں اُن کے بزرگوں کی والہانہ محبت اور شفقت کا عنصر بدرجۂ اتم موجود تھا۔ نیّر نے لکھا ہے کہ اُن کی زندگی کی بنیاد کو مستحکم کرنے میں اُن کے ہندو دوستوں کا مکمل تعاون رہا۔ بچپن میں نیّر ہمناباد میں ویربھدر تہوار اور مانک نگر میں مانک پربھو جاتراؤں میں شامل ہوتے اور راتیں مندروں میں بھجن سننے کے بعد اپنے ہندو دوستوں کے ساتھ وہیں سوجاتے۔ یہ واقعہ آج کے ماحول کے لئے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اس واقعہ سے ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد کو استحکام مل سکتا ہے۔

ہمناباد میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام نہ ہونے کے باعث نیّر کو حیدرآباد آنا پڑا۔ نیّر میں بچپن سے ہی کچھ کر دکھلانے کی دُھن تھی، لیکن اُن کی والدہ محترمہ اپنے لاڈلے کو نظروں سے دُور ہوتے دیکھنے کو تیار نہ ہوئیں۔ پھر بھی نیّر نے اپنے خاندانی روایات کو توڑ کر حیدرآباد کی سرزمین پر اپنے قدم رکھے۔ یہاں اُنھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم او ایل اُردو (مماثل ایم۔ اے) کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے کامیاب کیا۔ یہاں نیّر (سلسلہ پھولوں کا میں) اُردو کالج حمایت نگر کا ذکر کرتے ہیں جہاں نیّر بزم ادب اُردو کے صدر تھے۔ اُنھوں نے کالج میں شعر و سخن کی بنیاد ایسی رکھی کہ جس نے نیّر کی شاعرانہ زندگی کو ایک

خوبصورت موڑ دیا۔ اُن کی شاعرانہ و ادبی سرگرمیوں میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا اور آج نیّر ایک مقبول اور معتبر شاعر کی حیثیت سے ہر خاص و عام میں یکساں طور پر مقبول ہو رہے ہیں۔

اپنے کالج کی طالب علمی کے دور میں نیّر نے کئی ادبی خدمات انجام دیئے ہیں۔ نیّر لکھتے ہیں کہ اسی دور میں وہ روزنامہ سیاست سے وابستہ ہوگئے سیاست کے جوائنٹ ایڈیٹر جناب محبوب حسین جگر نے سیاست کے ہفتہ وار کالم "محفلِ شعر" کے اہم کام میں نیّر کو شامل کرلیا۔ تب سے آج تک نیّر سیاست خاندان کے ایک ہر دل عزیز اور چہیتے فرد ہیں۔ تیس برسوں کی اپنی طویل ادبی خدمات کے لئے نیّر ملک کے ادبی حلقوں میں ایک معتبر، فعال اور انتہائی کارکرد شخصیت کی حیثیت سے جانے اور مانے جاتے ہیں۔ جہاں نیّر نے سکریٹریٹ میں گزیٹیڈ آفیسر کے عہدہ کو بحسن و خوبی نبھایا اور کچھ افسروں کی تاناشاہی کے خلاف آواز اُٹھائی، وہیں اعلیٰ افسروں کے ساتھ اپنے بہترین تعلقات کا اظہار بھی کیا۔ حقیقت میں نیّر دوستوں کے بہترین دوست اور بدخواہوں کے کٹر مخالف ہیں۔ وہ صرف اپنے ضمیر کی آواز کو اہمیت دیتے ہیں۔ اُنھوں نے کبھی کسی سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ انہوں نے سکریٹریٹ میں رہ کر اپنے اندر کے شاعر کو کمزور ہونے نہیں دیا۔ جن ۲۷ اعلیٰ افسروں سے ان کے قریبی اور دوستانہ تعلقات رہے ان میں رائے کنج بہاری لال، یس اے قادر، سید ہاشم علی اختر، بھارت چند کھنہ، خالد انصاری، نریندر لوتھر، غلام احمد، غلام دستگیر قریشی، تراب الحسن کے نام سرِ فہرست ہیں۔ سکریٹریٹ کی تاریخ میں پہلی دفعہ اُنھوں نے

اُردو اسوسی ایشن قائم کی جس کے وہ آج بھی جنرل سکریٹری ہیں۔

اُن ہی دنوں شری نیرؔ نے آندھرا پردیش ہندی اکیڈیمی کی گرانٹ کے لئے کوشش کی، اُن کی یہ تگ و دو اِس بات کا ثبوت ہے کہ نیرؔ کے دل میں ہندی اور ہندی والوں کے لئے کتنا پیار ہے۔ حیدر آباد کی گنگا جمنی تہذیب کی بقا کے لئے نیرؔ اُردو ہندی کے ملے جلے مشاعروں کو ہمیشہ بڑھاوا دیتے رہے ہیں۔ "سلسلہ پھولوں کا" کی پاکیزہ خوشبو سے بھی قارئین کو واقف کرانا ضروری ہے۔ اِس سے نیرؔ کا مقام کچھ اور اونچا ہو جاتا ہے۔ اپنا خود نوشت میں نیرؔ نے اپنی ایک مداح کا ذکر کیا ہے جو موسمی پرند کی طرح شاعر سے فون پر اُس کی نظموں اور غزلوں کی تعریف کیا کرتی تھی۔ اس پاک دل شاعر نے ذہنی سطح پر روایت سے ہٹ کر جو رائے اُس مداح لڑکی کے تعلق سے پیش کی ہے، وہ قابلِ تعریف ہے۔

"اُس کے لب و لہجہ میں ایک ایسی بیٹی کی خوشبو شامل ہے جس کی تربیت ایک علمی و ادبی گھرانے میں ہوئی ہے۔ وہ لڑکی فون پر بہت دیر تک گفتگو کرتی ہے۔ اُسے میں نے آج تک نہیں دیکھا، لیکن اُس کی آواز اور اندازِ گفتگو سے میں نے اُس کی ایک خیالی تصویر بنا لی ہے۔ یقیناً وہ میری بیٹی نسرین کی طرح سیدھی سادی پیاری پیاری سی ہوگی۔"

نیرؔ کی زندگی کا ایک اور ناقابل فراموش واقعہ کچھ یوں ہے۔ نیرؔ کی ایک اور مداح لڑکی ایک مشاعرے میں نیرؔ کا پیچھا کرتی ہوئی پہنچتی ہے

اور اپنی ڈائری بڑھاکر نہ صرف آٹوگراف کا مطالبہ کرتی ہے بلکہ نیئر سے خود انھیں کا یہ شعر لکھنے کے لئے اصرار بھی کرتی ہے ؎

کہتے کہتے رُکتے کیوں ہو، دل میں جو ہے کہہ دو بھی
ہم بھی کوئی غیر نہیں ہیں آخر اتنا سوچو بھی

آٹھ کتابوں کے اس حساس شاعر و ادیب صلاح الدین نیرؔ کو اپنی خود نوشت لکھنے کا خیال اُس وقت آیا جب سارا شہر کرفیو کی منحوس گرفت میں تھا اور شاعر کو اتنی لمبی فرصت زندگی میں پہلی بار ملی تھی۔ اسی فرصت کے لمبے لمحات میں پھولوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ کرفیو زدہ اس شہر کے اپنے مکان میں اس حساس شاعر نے صرف دس دن میں یہ کتاب لکھی۔

اسی دوران دور درشن والوں نے نیئر کے معتبر نام کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے عوام کے نام صلاح الدین نیئر کا پیغام ٹیلی کاسٹ کیا۔ شعراء اور ادیبوں کے لئے یہ ایک قابلِ فخر بات ہے۔

"سلسلہ پھولوں کا" بے شک ہم سب کے لئے ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔

--

(تبصرہ 'ہندی ملاپ'، حیدرآباد۔ ۱۹۹۲ء)

○

مناظر عاشق ہرگانوی

خوشبو کا سفر

صلاح الدین نیّر کہنہ مشق شاعر ہیں۔ 'خوشبو کا سفر' ان کا پانچواں مجموعۂ کلام ہے۔ اِس مجموعہ پر یوپی اُردو اکیڈیمی نے انعام بھی دیا ہے۔

صلاح الدین نیّر زندگی کی نمو پذیر قدروں سے گہری اور مخلصانہ وابستگی رکھتے ہیں۔ وہ خیر کے وسیع تر مفہوم میں اس کے علمبردار ہیں اور منفی قدروں کے خلاف شدید رویّہ رکھتے ہیں۔ اس سے ان کی سوچ اور شاعری کی معنویت و مقصدیت کا تعین ہوتا ہے وہ 'حُسن و رعنائی' کی گل پوش وادی سے گذرتے ہوئے زندگی کی حقیقتوں کے لئے سایۂ دشت تک آئے ہیں۔ زندگی اور انسان کے حُسن سے انھوں نے بے محابا والہانہ محبت کی ہے۔ اس کے باوجود وہ یاس پرست ہرگز نہیں ہیں، حالانکہ اہلِ عشق کا حسرت و یاس سے جنم جنم کا ناطہ ہے۔ مگر نیّر دُکھ اور یاسیت کو خود پر طاری نہیں کرتے بلکہ اس کا کُھلے دل سے سواگت کرتے ہیں اور اس سے کیف و لذّت حاصل کرتے ہیں۔ دراصل یوں ہے کہ وہ دکھ کے دوام سے واقف ہیں۔

طے کرنا ہے لمحوں میں برسوں کی مسافت کو نیّر مرنے آنے تک کچھ بھا نہیں بچا رکھنا

تشنگی عام ہے کس کس سے لڑوگے نیّرؔ ۔ مے کی تقسیم کہاں حسب روایات ہوئی

نیّرؔ ہوا کا جھونکا تھا آکر چلا گیا ۔ لیکن اُس ایک خوشبو کی تاثیر رہ گئی

ہمارے بیچ جو خوشبو کا ایک رشتہ ہے ۔ اُس ایک رشتہ کو نیّرؔ ترا نبھائے گا

خوشبو کے اس رشتے کو نبھانے کا یہ نرالا انداز دیکھئے

آپ کے آنگن کی خوشبو ساتھ ہی آجائیگی ۔ میرا لڑکا اپنے گھر جب لے کے دولہن آئیگا

صلاح الدین نیّرؔ کی غزلوں میں گہرائی ہے ۔ تخیل اور اسلوب میں انفرادیت ہے ۔ اشعار میں جوان محبت کی سرشاری ہے ، خوبصورتی ہے ۔ آج ہے خوبصورت مسرتیں ہیں اور لمحاتی غم بھی ہے ۔ انھوں نے جدید غزل سے اپنے فاصلے کو قائم رکھا ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ مزاج کے لحاظ سے کلاسیکی غنائی انداز کے شاعر ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کا رشتہ لمحۂ موجود کے ساتھ بہت گہرا ہے ۔

--

(تبصرہ " توازن " مالیگاؤں)

۱۹۸۴ء

ڈاکٹر مظفر حنفی (بھوپال)

گلِ تازہ

"گلِ تازہ" مل گیا تھا۔ آج اور ابھی مکمل پڑھ کر اٹھا ہوں۔ اگر نقاد ہوتا تو غزل کے مختلف ادوار کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے ہر دور کے شعراء کے مدارج کا تعین کرتا۔ پھر عصرِ حاضر کے غزل گو شعراء سے آپ کے کلام کا موازنہ کرتا اور آپ کے شاعرانہ مقام کی نشاندہی کرتا۔ محقق ہوتا تو اردو کیسے پیدا ہوئی قسم کے سوال سے ابتداء کرتا اور آپ کے کلام تک آخر میں پہنچ کر مومن اور آپ کی مشابہت کا شوشہ چھوڑتا۔ شخصی دوست ہوتا تو 'گلِ تازہ' کے وجود میں آنے کے اسباب پر بحث کرتا۔ دشمن ہوتا تو خیالات کو دقیانوسی بتلا کر مختلف غزلوں میں ایطاء و شترگربہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔ مصلحت شناس ہوتا تو دس بارہ اشعار منتخب کرکے ہر شعر کا تجزیہ کرتا۔ چاپلوس ہوتا تو آپ کو میر و غالب کا ہم پلہ قرار دیتا۔ اور ثبوت میں دس بیس اشعار گلِ تازہ سے چھانٹ کر قارئین کے سامنے رکھتا۔ لیکن نیر صاحب آپ نے بھی کس شخص سے گلِ تازہ پر رائے طلب کی ہے جو ان میں سے کہیں بھی تو نہیں۔ لے دے کر طنز نگار ہے، نثر میں بھی اور نظم میں بھی۔

دو ٹوک بات تو یہ ہے کہ آپ کے ہاں ملتے والے دھیمے لہجے پیچیدہ بے احساس اور مترنم بحروں کے استعمال نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے اور دوسری بڑی بات یہ ہے کہ آپ نے یہ صلاحیتیں صرف بے دانی اور لکیر کی فقیر قسم کی غزلیں کہنے پر صرف نہیں کی ہیں بلکہ اکثر و بیشتر بڑے نادر اور نئے خیالات "گلِ تازہ" میں نظر آتے ہیں۔

کچھ لوگ ناراض ہوں گے لیکن یہ بھی کہوں گا کہ حیدرآباد کے سکندر علی وجد، شاہد صدیقی اور اسی قسم کے میرے آٹھ پسندیدہ شاعروں میں اب نو ویں کا اضافہ ہو گیا ہے، اور وہ صلاح الدین نیّر ہیں۔

(۱۹۶۶ء)

٭ ٭ ٭

ناظم اجملی

گلِ تازہ

ارضِ دکن کی شاندار ادبی خدمات کا اعتراف اب سب کرنے لگے ہیں۔ بالخصوص اُردو شعر و نثر کے قدیم سرمایے کی اہمیت، دکنی فنکاروں کی دین سے بڑھی ہے۔ ہمارے کلاسیکی ادب کی ایک مکمل ذی شان تاریخ، دکن میں مرتب ہوئی ہے اور اُردو والے دیارِ دکن کے اِس تاریخی احسان کو غالباً کسی دور میں بھی فراموش نہ کر سکیں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ تو اور زیادہ باعثِ اطمینان و مسرت ہے کہ آج بھی دکن میں ادبی سرگرمیوں اور تخلیقی کاوشوں کا وہی عالم ہے۔ ایک سے ایک اچھے شاعر اور ادیب منظرِ عام پر آئے ہیں اور آتے جا رہے ہیں۔

دکن کے نئے باصلاحیت اور ذی شعور شعراء میں ایک نام صلاح الدین نیّر کا آتا ہے۔ جن کی غزلوں کا مجموعہ ۱۹۶۸ء میں "گلِ تازہ" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ صلاح الدین نیّر ۱۹۵۸ء سے شعر گوئی کی طرف مائل ہیں۔ شعر و ادب کی دنیا میں ۷، ۸ سال کی مدت زیادہ نہیں ہوتی۔ اتنا وقفہ تو اصلاح لیتے لیتے اور قلم سنبھالتے سنبھالتے گذر جاتا ہے۔ اس کے برعکس نیّر میاں

نے اتنی ہی کم مدت میں اپنی فکری پختگی، ذوقِ سلیم، تخلیقی صلاحیت اور تازہ کاری کی شاندار مثال پیش کی ہے۔ ایسی مثال کہ جس کی بنیاد پر ایک کامیاب مستقبل کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ "گلِ تازہ" کے مطالعہ کے بعد قاری پر سب سے پہلا ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ شاعر محض تفریحِ طبع اور تضیعِ اوقات کے لئے شعر گوئی کی طرف مائل نہیں ہوا ہے بلکہ کچھ نہ کچھ پسِ پردہ ساز ہے، جذبۂ دل کا کوئی نہ کوئی ایسا معاملہ ضرور ہے جس کی پردہ داری شعروں میں کی جا رہی ہے۔ پتہ نہیں راہِ سکوں کی کس منزل سے نیّر صاحب کو لوٹ آنا پڑا۔

گلِ تازہ میں احساسات کی وسیع دنیا آباد ہے۔ اکثر و بیشتر صفحوں پر ایک ایسے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں جو نشۂ عشق اور سرورِ محبت سے سرشار ہے۔ ناکامی، تشنگی اور محرومی کا شدید احساس ملتا ہے۔ نیّر صاحب کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے غزل کو اس کی اپنی خصوصیتوں کے ساتھ برتا ہے۔ ایک تو اُن کی فطری تخلیقی صلاحیت، دوسرے عالمِ اندروں کا نہج اور تیسرے پیمانۂ غزل، انہوں نے تازہ خیالی، ندرتِ فکر، خلوصِ فن اور شعورِ بیدار کا پاس ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے۔ قریب قریب ان کی تمام غزلوں میں جذبۂ احساس کی دھیمی آنچ موجود ہے اور یہی گرمیٔ کلام قارئین کے لئے وجہِ کشش ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

غالباً ٹوٹا کسی مظلوم کا تارِ نفس ۔ دور تک آواز ہے آواز ہی آواز ہے

خوشبوئے بہاراں درِ زنداں پہ کھڑی ہے ۔ میں ہوں کہ مرے پاؤں میں زنجیر پڑی ہے
یہاں تو ایک بھی اپنا نہیں ہے ۔ یہ کس میلے میں آکر کھو گیا ہوں
تمام عمر ہنسی کے لئے ترستے ہیں ۔ تمہارے شہر میں ایسے بھی لوگ بستے ہیں
تنہائی کے عالم میں مرے پاس رہی ہے ۔ وہ یاد جو احساس کے سانچوں میں ڈھلی ہے
چلے ہیں چھوڑ کے جو ذہن، خوابگاہوں میں ۔ بھٹک رہے ہیں وہی قافلے اُجالوں میں
اندھیرے راہ نہ روکیں گے تم چلے آؤ ۔ ہے روشنی ابھی بجھتی ہوئی نگاہوں میں
اپنی نظر سے کوئی ہمیں کیا گرائے گا ۔ ہم اہلِ درد اپنی نظر میں بلند ہیں
خود اپنی ہی گلیوں میں بھٹکتے ہیں ابھی لوگ ۔ یہ شہرِ غزالاں ہے کہ جادو نگری ہے

نیئر صاحب کے شعروں میں ایک مخصوص نوعیت کی وارفتگی، والہانہ پن، سرمستی اور اضطراب ہے ۔ احساسات کی شدت سے پتہ چلتا ہے کہ کسی گُلِ تازہ کی نگاہ اُن کے دل سے جگر تک اُتر گئی ہے ۔ اور اسی لئے اُن کے کلام میں سوز و تاثیر کی ایک پُر لطف کیفیت ملتی ہے ۔ اُنہیں خود اعتراف ہے کہ

ہر غزل کی ابتداء کرتا ہوں تیرے نام سے

اُس گُلِ تازہ کا جادو اُن کی روح کی گہرائیوں میں موجود ہے ۔ دیکھئے چند اشعار

ہم تو صحرا نصیب ہی ٹھہرے ۔ تیرا کیا ہوگا اے گُلِ تازہ
گُلِ تازہ ہے ہر زخمِ تمنا ۔ محبت کو دعائیں دے رہا ہوں
نیئر نے آج ایک گُلِ تازہ کی یاد میں ۔ پھولوں کے بدلے راہ میں کانٹے بچھا لئے
کیسے کیسے پھول دیکھے ہم نے گلشن میں مگر ۔ اُس گُلِ تازہ کی خوشبو کے سوا کیا یاد ہے

صلاح الدین نیئر نئے دور کے شاعر ہیں ۔ نئے ماحول میں پنپ رہے ہیں

ہیں۔ عالمِ جدید کے علوم وفنون کی رفتار سے ان کو واقفیت حاصل ہے۔ لیکن یہ بات بڑے اطمینان کی ہے کہ وہ نہ تو ہیئتی تجربے کے سلسلے میں یا تشی کر رہے ہیں اور نہ ان کے کلام میں سنجیدگیٔ فکر، ـــــــ غیر ضروری ابہام پسندی، مہمل علامت نگاری ملتی ہے۔ نیر صاحب موجودہ عہد کے ان بیماریوں سے محفوظ ہیں۔ خدا کرے وہ ہمیشہ ان سے محفوظ رہیں۔ قوتِ بیان اور اظہار پر ان کی قدرت بھی کم نہیں ہے۔ جذبہ وخیال کی تجسیم کے لئے وہ موزوں ترین پیراہن کی تلاش کرتے ہیں اور اکثر و بیشتر اُن کی یہ جستجو کامیاب نظر آتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ مستقبل میں ان کی سخن طرازی نئے نئے جوہروں کو سامنے لائے گی اور وہ اپنے لئے ایک امتیازی راستہ دریافت کر سکیں گے۔

("کوہ کن" پٹنہ ـ ۱۳ر جون ۱۹۶۶ء)

-٢- -٢- -٢-

خلیل امیلزی

"گُلِ تازہ"۔ میری نظر میں

زندگی، غم و حسرت، بہار و خزاں، نور و ظلمت، نشیب و فراز اور یاس و امید کا ایک ایسا معجونِ مرکب ہے جس میں خوشیاں کم اور غم زیادہ ہیں۔ جسے عرفانِ غم حاصل ہوتا ہے وہ مصائب و آلام کی گہرائیوں میں ڈوب کر آپ اپنی نئی زندگی کا خالق بن جاتا ہے۔ غمِ حیات اور غمِ دوراں کے اُٹھتے ہوئے شعلے اُس کے احساس کو اپنی زبان بخشتے ہیں جس کی مدد سے وہ اپنی داخلی اور خارجی کیفیات کی بڑی خوبی سے عکاسی کرتا ہے۔ اس کا طائرِ تخیل حسین و دیدہ زیب، نظر فریب اور عطر بیز الفاظ کا جامہ عطا کر کے ایسی تخلیقات پیش کرتا رہتا ہے جس کی نظر فریبی اور عطر بیزی قاری کے دل و دماغ کو محظوظ ہی نہیں کرتی بلکہ وہ اسکی تخلیقات میں اپنے دل کی گہر دھڑکنیں اور گذشتہ لمحات کی یادیں محسوس کرتا ہے۔ ایسی شاعری اور ایسا شاعر روایت کی زنجیروں سے آزاد رہ کر زندگی کی عظمتوں کی صحیح عکاسی کر کے تاریک حیات کی سیاہ راتوں میں صبحِ نو کا پیامی بن سکتا ہے۔

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ شاعر، عام انسانوں سے زیادہ ذی عقل اور ذکی الحس ہوتا ہے۔ اس کا احساس بہت نازک اور تیز تر ہوتا ہے۔ وہ عالمِ رنگ و بو کی ہر شئے کو بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے اور اس سے بہت جلد متاثر بھی ہو جاتا ہے۔

صلاح الدین نیر اسی قسم کا ایک بلند فکر، ذکی الحس اور ذہین شاعر ہے۔ جس کے ذہن، دماغ کے نورانی دریچوں میں محبت و خلوص کا حسین تاج محل ہے۔ جن کی شاعرانہ صلاحیتوں اور پختہ شعور نے شعر و شاعری کی سنگلاخ زمینوں میں کبھی آنسو، کبھی خونِ جگر اور کبھی دل کا لہو صرف کر کے اپنے نخلِ شاعری کو کچھ اس انداز سے سیراب کیا ہے کہ اس میں نئی رنگت، نئی بو، نئی مہک، نئی چمک اور نئی شان کا گُلِ تازہ مسکرا اٹھا "گُلِ تازہ" کی ہر پنکھڑی میں حقیقی پیار اور سچے خلوص کی مہک بسی ہوئی ہے۔ اس کے ہر ورق پر مشاہدات، تجربات اور فن کے تقاضوں کا رنگ بکھرا ہوا ہے۔ گُلِ تازہ میں کلیوں کی لطافت اور کانٹوں کی چبھن بھی ہے۔ جنوں کے ہوشمند ترانے اور خرد کے پُرسوز نغمے گُلِ تازہ کے اشعار میں گھل مل گئے ہیں۔ نیر نے اپنے ہر خیال اور مشاہدہ کو بڑی خوبی اور تکمیل کے ساتھ گُلِ تازہ میں پیش کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام میں جذبات کی صحیح اور پُراثر تاثیر کے ساتھ ساتھ احترامِ فن اور احترامِ آدمیت بھی ہے۔ گُلِ تازہ کا انتساب اور نام دونوں میں بڑی جاذبیت اور معنویت موجود ہے۔ اس کا یہ رومانی نام مجربانہ معنویت

سچے پیار کی عظمت اور محبوب کی پسندیدگی کا نتیجہ ہے۔ جس کے متعلق اس کے زبانی سنیئے۔

مجموعۂ کلام کا جب وقت آگیا ۔ تم کو پسند جو تھا وہی نام رکھ دیا
گلِ تازہ ہے ہر زخمِ تمنا ۔ محبت کو دعائیں دے رہا ہوں
تجھے کس نام سے آواز دوں میں اے گلِ تازہ۔ یہاں کا ہر شگفتہ گُل ترا ہم نام ہوتا ہے
نیّر کسی دن اُس گلِ تازہ سے یہ کہنا۔ ہر سانس میں خوشبوئے وفا پا تو رہا ہوں
کیسے کیسے پھول دیکھے ہم نے گلشن میں مگر۔ اُس گلِ تازہ کی خوشبو کے سوا کیا یاد ہے

انسانی حیات، خوشی و غم، بہار و خزاں، کامیابی اور ناکامی تلخ و شیریں حالات کے ہر موڑ سے گذرتی ہے۔ نیّر کی زندگی بھی منزلِ حیات کے متعدد موڑوں پر سے اِس فاتحانہ شان سے گذری ہے کہ اُتھل پتھل اس کی گردِ راہ کو بھی نہ چھو سکی۔ وہ اچھے بلند اور پختہ عزائم کے ساتھ ساتھ بھرپور صلاحیتوں کا مالک ہے۔ نیّر کے احساس و اظہار کا طریقہ انفرادی ہے۔ اُس نے قدما کے اشعار کو اُلٹ پلٹ کر کے پیش کرنے کی ناجائز حرکت کبھی نہیں کی اور نہ چھپے چھپائے ہوئے نوالہ کو چبانے کی سعی کی ہے۔ اس حقیقت کے لئے اس کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے۔

ہر شعر مرا پرتوِ احساس ہے نیّر ۔ جو دل پہ گذرتی ہے وہی بات کہوں گا
شعر کہتا ہوں ہمیشہ ہٹ کے طرزِ عام سے ۔ ہر غزل کی ابتدا کرتا ہوں تیرے نام سے

میں نے گلِ تازہ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ اس لئے میں بلا خوف و تردید کہہ سکتا ہوں کہ گلِ تازہ نیّر کی عظیم تخلیق ہے جس کے اشعار فکر و خیال کی کئی

بلندیاں دکھاتے ہیں۔ عقل کے گوشے سنوارتے ہیں۔ زندگی کی جیتی جاگتی حقیقتوں کو اُجاگر کرتے ہیں۔ روح کی شگفتگی اور ذہن کو طراوٹ دیتے ہیں۔ انسان کے فطری جذبات، سماجی رجحانات، ماحول اور وقت کے تذکرے سناتے ہیں۔

نیّرؔ نے گُلِ تازہ کو انسانی شرافت، عصری رنگ اور صحت مند ادبی قدروں سے سنوارا ہے۔ جی تو چاہتا تھا کہ گُلِ تازہ پر ایک طویل اور سیر حاصل مقالہ لکھوں مگر اہلِ ذوق کی نزاکتِ طبع کے اندیشے اور میری عدیم الفرصتی کے سبب نیّرؔ کے اشعار بغیر تبصرہ پیش کر رہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

اتنے لگے ہیں زخم کہ دل بولتا نہیں ۔ آئینہ اپنا بھید کبھی کھولتا نہیں
قدم تمہارے اندھیروں نے جب بھی روک لئے ۔ تو ہم نے راہ میں جگنو اُڑا دیئے کہ نہیں
تم جادۂ وفا میں میرا ساتھ دے چکے ۔ آرام چاہتے ہو تو دیدہ مجھے تھکن
یہ اہلِ بزم نیّرؔ شمع کے آنسو ہی پیتے ہیں ۔ کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ پروانہ جلا کیوں ہے
چاہے مٹی کا پیالہ ہو کہ شیشے کا گلاس ۔ آپ کے ہاتھ سے چھو جائے تو سونا ہوگا
اک تھکے ہارے مسافر کو سکوں مل جاتا ۔ کاش کھل جاتے ترے گیسوئے خم دار کے بل
مجھکو تمہارے نام سے ہر غم قبول ہے ۔ میرے شکستہ دل کا ہر اک زخم پھول ہے
دیر تک عارضِ گلنار پہ گھونگھٹ نہ رہے ۔ گرمئ حسن سے ڈر ہے کہ کہیں دلہن نہ جلے

آخر میں اتنا کہوں گا کہ نیّرؔ کا ذہن سچے خلوص و پیار کی آگ میں تپ کر کُندن بن گیا ہے جسکی وجہ سے اس کا کلام ضو ریز اور نُور بار ہے۔

(۱۹۶۶ء)

جی - ایم - راہی

گُلِ تازہ

وہی شخصیتیں اپنے فن کے لازوال نقوش چھوڑ سکیں جن کی تخلیقات زندگی، ماحول اور مسائل کی آئینہ دار تھیں۔ ایسے ہزاروں سال پہلے کے وہ اشعار جو انسان کے احساسات و جذبات کے موثر ترجمان ہیں۔ ہمارے دلوں میں آج بھی نشتر کی طرح چبھ کر رہ جاتے ہیں۔ لہذا یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ انسان کی فطرت میں ازل سے ابد تک ہم آہنگی رکھی گئی ہے اور قلبِ انسانی کے مختلف محسوسات کی صحیح عکاسی میں لازوال ہونے کا راز مضمر ہے

صلاح الدین نیّر کی فہم و فراست، حساس طبع فطرت، فکر کی گہرائی اظہارِ خیال پر عبور چند ایسی نمایاں خصوصیات ہیں جن سے اُردو ادب کو کافی توقعات رکھنی چاہئیں اور انھوں نے اپنے مجموعۂ کلام "گُلِ تازہ" میں مختلف بحور پر بڑے اعتماد کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے۔ یہ مجموعہ اُردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہے جس کی روشنی میں نیّر مشاہیرِ فن کاروں کے زمرے میں آجاتے ہیں۔

گُلِ تازہ مجموعی طور پر کسی ناقابلِ فراموش حادثے کا آئینہ دار ہے۔ تقریباً ہر غزل میں کوئی نہ کوئی واقعاتی شعر موجود ہے جو قاری کے دل میں نشتر بن کر اتر جاتا ہے

نیتر کا عشق کامیاب عشق نہیں ہے۔ اُن کی تخیل کی وسعتوں میں بے پناہ غم ہے مگر ان کی قوت برداشت بھی قابلِ ستائش ہے۔

سب تبسم پرست ہیں نیتر ۔ کس کو ہے میرے غم کا اندازہ
احساس کی شمعوں کی لویں اور بڑھاؤ کہ ۔ خاموش پرستش کے لئے ایک ہی حل ہے
وہ بھی دن دُور نہیں آنکھوں سے ٹپکے گا لہو میرے اشکوں کا اگر یوں ہی تصرف ہو گا
زخموں سے تو پھولوں میں اضافہ ہی ہوا ہے میں باعثِ ویرانیٔ گلزار نہیں ہوں
درد کی شمعیں ابھی خیر سے جلتی ہیں ندیم شہر کی گلیوں سے اُٹھے گا دھواں میرے بعد
تم کو نفس نفس میں مسرت کی ہے تلاش لیکن مری حیات کے نغمے ہیں دل خراش

ناکامیوں اور مایوسیوں کے مسلسل تھپیڑوں کے باوجود اُن کا غم، آہ و بکا درد و کرب اور چیخ و پکار کی شکل نہیں اختیار کرتا ۔ وہ صبر آزما گھڑیوں میں عزم و ہمت کا پیکر بن جاتے ہیں ۔ ان کا معیاری عشق ہے ۔ اپنے محبوب کی غیر توجہی پر طعنہ زن نہیں ہیں ۔ ان کے کلام میں سبق آموز پہلو شروع سے آخر تک نمایاں ہے ۔ زندگی دراصل سراپا امتحان گاہ ہے ۔ غم اور خوشی دونوں کیفیتوں سے اگر انسان لطف اندوز ہونا سیکھ جائے تو وہ بڑے بڑے مسائل کا عزم و یقین کے ساتھ مقابلہ کر سکتا ہے ۔

جب تک مجھے جینا ہے سلیقے سے جیوں گا ۔ اے رسم وفا ! تجھکو نہ بدنام کروں گا
گھبراؤ نہیں پیار کو رسواہ نہ کروں گا ۔ تم پاس سے گذرو بھی تو آواز نہ دوں گا
شعلے ہوئے رقصاں نہ دھواں ہی نظر آیا ۔ محفل میں تری ایسی بھی اک شمع جلی ہے
ہونٹ ہلتے نہیں اندیشۂ رسوائی ہے ۔ مجھ سے بڑھ کر کوئی محتاطِ وفا کیا ہو گا

ادب، زندگی اور سماج کا آئینہ ہے۔ قوم اور ملک کے معیار کی کسوٹی ہے۔
بیدار و خواب آور ذہنوں کا ترجمان ہے۔ ایسے فن کاروں کے نقش بہت جلد
ماند پڑ گئے جنھوں نے اپنے ماحول سے فرار اختیار کیا اور محض تخیل پر بھروسہ کیا۔
دراصل ہر شخص کے دل پر کسی مخصوص واقعہ کا کم و بیش ایک سا اثر ہوتا ہے۔
کیٹس (Keats) کی شاعری اور ہارڈی کی ناولیں زندگی کے مختلف حادثوں
کی ترجمان ہیں جو ہر قوم و ملک کے لوگوں پر یکساں اثر انداز ہوتی ہیں اور اسی لئے
ان میں یونیورسل اپیل ہے۔ ہر قاری یہ محسوس کرنے لگتا ہے

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

عشق، بنی نوع کی فطرت میں ٹھوس ٹھوس کر بھرا گیا ہے۔ عشق کے
اثرات سے انحراف کرنے والا انسان کے زمرے میں نہیں آتا۔ نیر نے عشق کی
نازک سے نازک کیفیتوں کو محسوس کیا اور بڑی حسن و خوبی سے ان کو شعر
ڈھال دیا ہے جسے سن کر دل بے قرار ہو جاتا ہے۔ ان کے ایسے اشعار جو محسوسات
پر مبنی ہیں لازوال ہیں اور ہر دور میں گل تازہ کی طرح مہکتے رہیں گے۔

جب تمہارے خط کو میں نے نذر آتش کر دیا - ایک ایک لفظ وفا نے دور تک پیچھا کیا
آخری تحریر تھی اُن کی یہ میں نے کیا کیا - خود بھی تنہا ہو گیا اُن کو بھی تنہا کر دیا
وفا کی آخری منزل ہے شائد - بڑی مشکل سے آنسو پی رہا ہوں
اب تک بھی زخم تازہ ہیں میری حیات کے - ڈالی تھی زندگی پہ اچٹتی ہوئی نظر
پہلے میں قرض اپنے غموں کا چکا تو لوں - ٹھہرا ہے ہجوم اشک! بہت مسکراؤں گا
آئے ہو تو روبرو بیٹھو گھڑی بھر کے لئے - آنکھ بھر کر آج تک میں نے تمہیں دیکھا نہیں

لوٹا ہے کس نے یاد نہیں کاروانِ دل۔ تم ساتھ ساتھ تھے مجھے اتنا تو ہوش ہے
اشارہ و کنایہ، اصنافِ سخن کے ناقابلِ فراموش اوصاف ہیں۔ قاری
کا ذوقِ سلیم از خود شاعر کے نقطۂ نظر کو تلاش کرنے میں زیادہ لطف اندوز ہوتا
ہے۔ مگر یہ لازمی ہے کہ فنکار خود بھی اپنے اشارے کو بخوبی سمجھتا ہو اور اُسے
یہ اعتماد ہو کہ قاری بالآخر اُسی خاص مرکز پر آ ٹھہرے گا جس سے شعور پروان
چڑھتا ہے۔ جیتھر اور چھپان بیت کی عادت مختلف مسائل کا آسانی سے حل نکال
لیتی ہے۔ نیتر کے اشعار محض پروردہ تخیل نہیں ہیں بلکہ جیتے جاگتے ماحول کی
تلخیاں بھی نمایاں ہیں۔
جو لوگ بھول بیٹھے ہیں مجھ تم نصیب کو۔ میں اُن کو یاد کرتا ہوں میرا اُصول ہے
اک سانس بھی مل جائے سلیقے کی بہت ہے۔ فرصت نہیں دیں گے کبھی دنیا کے جھمیلے
اِس روشنی کے دور میں یہ آج کا سماج۔ تہذیبِ نو کے دوش پہ ہے ایک زندہ لاش ہے
جانے کیا پیغام لے آئی ہے اب کے فصلِ گل۔ ہر گُلِ تازہ کی آنکھوں میں ہے خون اترا ہوا
نُور کا دریا بہے گا ایک جوئے شیر کیا آج بھی دستِ جنوں میں تیشۂ فرہاد ہے
قوم اور ملک کی تعمیر میں شاعر نے ہر دور میں ہاتھ بٹایا ہے۔ مختلف مسائل کا
گہرا جائزہ لیا ہے اور تاریکیوں میں اپنی فکر و نظر کی شمعیں جلائی ہیں۔ میں ہنگامی
ادب کا قائل نہیں ہوں البتہ ترقی پسند ادب کی مقصدیت سے انحراف نہیں کرتا۔
ہر فنکار کو ایک مخصوص پلان کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ اگر قلب و نظر کو
مناسب تربیت نہیں دی گئی تو وہ نشیب و فراز پر کبھی عبور حاصل نہیں کر سکتے۔
خالی گرجنے سے زمیں سیراب نہیں ہوا کرتی۔ بیشتر شعراء چیخ و پکار اور گھن گرج

ـصہ ادب کا نام دینے لگے ہیں جو غلط ہے۔

ذہن ترقی پسندی کے ساتھ ساتھ پرانے ادب کے اثرات بھی

۔۔ دیگر مشاہیر اہل فکر و نظر کی طرح انھوں نے بھی غزل کے دامن کو

ـں کوشش کی ہے جو قابل ستائش ہے۔ ان کے اکثر شعروں میں

ملتا ہے۔ گویا وہ ایک سنگم ہیں جہاں نئے اور پرانے اصولوں کے

ملتے ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام "گلِ تازہ" میں وہ سب کچھ ہے جو

تقاضے کو پورا کر سکے۔

ـرُ تھا پھر وہی اُداسی تھی ۔ صبح دم کتنی غنچے آنکھ مل کے پچھتائے

تبسم کے گاتے ہیں عندلیب ۔ حالانکہ چاک چاک ہیں پھولوں کے پیرہن

ہیں اسے بنسی وقت ۔ شاہین ہوں میں اپنی نظر میں بلند ہوں

ـی سہی، اتنی بُری نہیں ۔ یہ آمدِ بہار کی تحریک ہی تو ہے

ـں سے رہا ساتھ مگر ۔ اپنی روش پہ آج بھی ہم کاربند ہیں

(۱۹۶۶ء)

-۰- -۰- -۰-

شوبھا ناتھ سنگھ

خوشبو کا سفر

صلاح الدین نیّر ہمارے اُن معروف شعرا میں ہیں جو برسوں سے ادبی جرائد و رسائل میں چھپتے آرہے ہیں اور برصغیر ہند و پاک کے عصرِ جدید کے شعراء میں اپنا مقام بنا چکے ہیں۔ کُل ہند اور ریاستی مشاعروں کے تعلق سے نیّر ایک جانے پہچانے فن کار ہیں۔ زیر نظر کتاب موصوف کی پانچویں شعری پیش کش ہے۔

نیّر نے جو تخلص اختیار کیا ہے اُس کی نشاندہی اُن کی تخلیقات کی مجموعی فضا میں روشنی کے وجود کی پاسداری کے ساتھ ملتی ہے۔ زندگی کی صحت مند روایات اور مثبت اقدار، صالح رجحانات اور عمدہ نظریات نیّر کی مجموعی تخلیقی سرشت پر چھائے ہوئے لگتے ہیں۔ زیست کی صداقت اور احساسات کی شگفتگی شاعر کے شعور کی عکاسی کرتی ہیں۔ اور اُس کا کلام اُس کے نجی تجربات و احساسات نیز سماج کی آپ بیتیاں سے عبارت ہے۔

اپنے زمانے کو پہچاننا بڑی بات ہے۔ صلاح الدین نیّر نے اپنے بیشتر معاصرین کے برعکس ایک سچی بوقلمونی اور حیاتی پہچانی بھیڑ میں شمولیت

کے باوجود اس میں کھو جانے سے بچنے کی سعی کی ہے۔ ان کی شاعری کا بالعموم اور غزل گوئی کا بالخصوص ایک الگ انداز ہے۔ ان کا اسلوب اور اندازِ بیان سادہ اور تصنع سے پاک ہے۔ احساس اور ادراک ایک دوسرے میں گڈمڈ نہیں ہوتے۔ اس معاملے میں نیّر نے ادراک یا اظہار کو کسی بڑی پیچیدگی سے سروکار نہیں رکھا اور سادی زبان میں اپنے مافی الضمیر کو قاری تک پہنچانا چاہا ہے۔ انہوں نے علامتیں وضع کرنے کی بجائے اُن علامات کا سہارا لیا ہے جو مانوس و مستعمل ہیں

صلاح الدین نیّر کا لب و لہجہ متین، نرم اور دل پذیر کیفیت کا حامل ہے جو انسان دوستی اور وفا کیشی کی خبر دیتا ہے۔ اُن کے اشعار میں والہانہ سپردگی کے ساتھ عزتِ نفس کا انجذاب پایا جاتا ہے۔ خوشی اور غم ہر طرح کی کیفیات میں اُن کی شائستگی اور وقار قائم رہتے ہیں۔ نیّر یاس پرست نہیں ہیں۔ اُنھوں نے دورِ حاضر میں اعلیٰ انسانی اقدار کے انحطاط کے نوحے نہیں لکھے بلکہ ان کے فروغِ نو کا پیام دیا ہے۔ نیز سلگتے ہوئے سماجی اور سیاسی مسائل کی کچھ ایسی چابکدستی سے ترجمانی کی ہے کہ غزل کا مزاج بھی بگڑتے یا بدلنے نہیں پایا اور اثر انگیزی بھی ناقابلِ فراموش حد تک احساس میں گھل مل گئی ہے۔ یہ کوئی آسان بات نہیں۔

دس پندرہ سال میں پانچ مجموعے یقیناً صلاح الدین نیّر کی قابلِ رشک حد تک پُرگو اور زود گو شاعر ہونے کا شرف بخشتے ہیں جو اُن کے غیر معمولی طور پر حساس ہونے کے ساتھ گہری تخلیقی لگن رکھنے کا پتہ دیتے ہیں۔ خاص کر جب کہ اُن کی پُرگوئی نے ان کے شعری معیار کو متاثر نہیں کیا۔

ہنوز صلاح الدین نیّر کا شعری سفر جاری ہے۔ ابھی وہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں سرگرم ہیں۔ لہٰذا ان کی شاعری کی صحیح قدروقیمت کا حتمی تعین قبل از وقت ہوگا۔ تاہم اس میں کوئی کلام نہیں کہ آپ اپنی تخلیقات کی بدولت بغیر کسی لیبل کے آج کے کامیاب شاعر ہیں۔ چند اشعار جو موصوف کے شعری وقار کے غماز ہیں، درج ذیل ہیں۔

اب تو آنگن میں مرے تُلسی کا پودا بھی نہیں ۔ میرے گھر کی ساری خوشیاں دیدۂ تر لے گیا

پیار خوشبو کا سفر ہے چل رہا ہوں صبح و شام ۔ اک نہ اک دن راہ میں تیرا بھی گھر آجائے گا

وہ صبح آس ہے جس کی جھلک آئے گی نیّر ۔ اس انتظار میں کب تک ہمیں بکھرنا ہے

گھبرا نا کیسا شہرِ حوادث ہیں دوستو ۔ سناٹا زندگی کا کبھی بولتا تو ہے

خوابوں میں بکھر جائے نہ یہ روشنی شب کی ۔ سوئی ہوئی پلکوں کو جگانے کے لئے آ

جس نے آہٹ بھی نہ چھوڑی اسکو اب ڈھونڈوں کہاں ۔ اپنی خوشبو تک وہ آنچل میں چھپا کر لے گیا

تمہارے قرب کی تسکین راس کیوں آتی ۔ یہاں سے دور اگر تم کو جا کے بسنا تھا

اک نسل میرے سامنے ہے کیا جواب دوں ۔ اجڑے ہوئے مکانوں کی تعمیر رہ گئی

سب چلے جائیں گے کل زخمی بدن رہ جائیگا ۔ شہر میں اک شخص بے گور و کفن رہ جائے گا

زیرِ نظر مجموعہ ایک تخلیقی شاعر کے شعری سفر کا وہ سنگِ میل ہے جو مستقبل کے تابناک منازل کا پتہ دیتا ہے۔ خوشبو کا سفر اردو کے شعری ادب میں یقیناً ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

(تبصرہ "فکر و فن" سہ ماہی۔ ہماچل پردیش)

(۱۹۸۴ء) -۲-

ڈاکٹر سیفی پریمی

زخموں کے گلاب

زخموں کے گلاب' صلاح الدین نیّر کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے گُل تازہ کی اشاعت ہو چکی ہے۔ اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر سیدہ جعفر نے لکھا ہے:-

"نیّر کی طرزِ ادا میں جو خاص رنگینی' لطافت' رچاؤ' ستھرا پن اور شادابی ہے۔ وہ اُن کی غزلوں میں ایک مخصوص تازگی اور انفرادیت پیدا کر دیتی ہے۔"

پروفیسر ابوظفر عبدالواحد نے کہا تھا۔

"اُس کا اسلوب' طریقۂ اظہار اس کی ماجرائی غزلوں میں بے حد محتاط اور بلیغ ہے۔"

"زخموں کے گلاب" میں غزلیں رومانی' سیاسی اور تاثراتی نظمیں شامل ہیں۔ حدیثِ دل' کے تحت نیّر نے اپنی زندگی اور محرکاتِ شعری کے متعلق اشارے کیے ہیں اور کسی مخصوص ادبی نظریہ کی ذہنی وابستگی سے انکار کیا ہے۔

"میں شاعری میں کسی خاص ازم پر ایمان نہیں رکھتا" مگر اِس

انکارِ باللسان کے باوجود ترقی پسند نظریہ کے عقائد اور جدیدیوں کا انتشارِ حیات، شاعر کی سیاسی نظموں اور غزلوں میں صاف نمایاں ہے۔ بعض غزلیات میں غزلِ مسلسل کا رنگ جھلکتا ہے۔ بعض مقامات پر مضامین کی تکرار بھی ملتی ہے لیکن شاعر نے جو کچھ کہا ہے اس میں صداقت اور تاثر ہے۔ قاری کی توجہ کو مبذول کرانے کا فن پایا جاتا ہے۔ کلام، عروض و بیان کے لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہے۔ غزل کی فضاء دلکش ہے۔ احساس و تجربے کے رنگ جھلکتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

مسرتوں کا ہمیں امتیاز نہ کر سکے - تمام عمر رُلاتی رہی ذرا سی بھول
وہی جنوں وہی خودداریاں سلامت ہیں - میں جی رہا ہوں اُسی شانِ کج کلاہی سے
رفیقو! پاؤں کے چھالوں کو اور چھلکاؤ - چراغ راہِ وفا میں ہے روشنی مدّہم
اجل تنہا پسندوں کے لئے ہے - مجھے دیکھو سراپا زندگی ہوں
کس کے ہونٹ جھکے ہیں کس کی زلف لہرائی - اس قدر نہ تھی پہلے شہرِ دل کی آبادی
خوشبوئے وفا ساتھ ہے گلشن ہو کہ مقتل - اس شہر کی مٹی میں ترا سانولا پن ہے
نہ جانے کب سے ٹپک رہا ہے لہو - بہت سے زخم ہیں تہذیب کی نگاہوں میں

شاعر کا ذہن زیادہ تر نظم سے مناسبت رکھتا ہے۔ بیشتر نظموں میں مشاہدہ کی سچائی، احساس کا کرب اور طرزِ اظہار کی ندرت پائی جاتی ہے۔ شاعر کی روح ایک بہتر اور شاداب زندگی کی تماشائی ہے۔ چنانچہ کون قاتل ہے، گاندھی اِزم " نئی آواز " وہ ایک لمحہ " وغیرہ نظمیں اسی قبیل کی ہیں۔ شاعر کی رومانی نظموں کا مرکز " گلِ تازہ " ہے۔ اصل میں یہ شاعر کی اپنی دل آویز علامت ہے۔

اس کا دائرہ اوراقِ زندگی کا محیط ہے۔ رومانی نظموں کے عناصر سے جو تصویر بنتی ہے اُسی کا نام زخموں کے گلاب ہے۔ اِس میں سماجی قدروں کے احتساب دو دلوں کی واردات، اندیشہ، آرزو، آسودگی اور محرومی وغیرہ تمام مرحلوں کا ایک مقامِ پُر ہجوم ہے۔ شاعر کی عمدہ نظموں میں بہار نالاں ہے ہم نشینو! "پھر کب آؤ گے" اوراقِ زندگی" ہیں۔ 'نذرِ مخدوم' یعنی مخدوم محی الدین کی وفات پر شاعر کے تاثراتِ غم میں خلوص اور زندگی کی حقیقت پسندی نمایاں ہے۔

پروفیسر احتشام حسین نے پیشِ لفظ میں فرمایا ہے

"طرزِ اظہار میں زیادہ ٹھیراؤ، رکھ رکھاؤ، پختگی اور شاعرانہ کیفیت کی نمود ہے۔"

اس مجموعے میں بہت سے ایسے پہلو ملیں گے جن کی توجیہہ و تشریح ترقی پسند اندازِ نظر ہی کو سامنے رکھ کر کی جا سکتی ہے۔"

(۱۹۷۳ء)

○

عبدالرحیم آرزو

صنم تراش

صلاح الدین نیر بحیثیتِ شاعر محتاجِ تعارف ہرگز نہیں ہیں۔ کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جنہیں ماحول بناتا ہے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ماحول کو بناتے ہیں۔ نیر صاحب دوسرے زمرے کے لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام "گلِ تازہ" "زخموں کے گلاب" اور "صنم تراش" سے اُردو حلقے بخوبی واقف ہیں۔

نیر صاحب کی شاعری سماج، ماحول اور حالاتِ زمانہ کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔ ان کی شاعری گل و بلبل کی داستان نہیں ہے۔ وہ چونکہ خود ایک حساس اور حوصلہ مند انسان ہیں اس لئے ان کی نظر حالاتِ زمانہ پر بڑی گہری ہے وہ سماج کے موجودہ ماحول میں گھٹن تو محسوس کرتے ہیں لیکن اس سے ہرگز گھبراتے نہیں ہیں۔ وہ محبت کو صنفِ شاعری کا اثاثہ تو ضرور سمجھتے ہیں مگر اس کی پاکیزگی اور طہارت کو مقدم تصور کرتے ہیں۔ وہ دوستوں کی بے اعتنائی کا شکوہ تو ضرور کرتے ہیں لیکن دوستی کی عظمت کو پارہ پارہ ہونے نہیں دیتے۔ وہ زندگی کے پُرپیچ راہوں سے گزرتے ہیں لیکن ہمت کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ثابت قدمی

سے اپنی راہ نکال لیتے ہیں اور دوسروں کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ شاعر چونکہ بذاتِ خود حساس ہوتا ہے اس لئے ہر معمولی حادثہ بھی اس کے لئے موضوعِ سخن بن جاتا ہے۔ وہ اس سے اوروں کے لئے ایک نتیجہ اخذ کرتا ہے، اس کو شاعری کا لباس پہناتا ہے۔ اِس لئے سماج میں شاعر کا بلند مقام ہے۔ وہ شاعری ہی کیا جو پڑھنے اور سننے والوں کے وجدان کو متحرک نہ کر سکے۔ وہ شاعری ہی کیا جو مردہ ضمیر میں زندگی کی حرارت نہ پیدا کر سکے۔ وہ شاعری ہی کیا جو مایوس اور نامراد انسانوں میں زندگی نہ بخشے، وہ شاعری ہی کیا جو ناموافق حالات سے گھبرا کر اندھیروں سے سمجھوتہ کر لے۔ وہ شاعری ہی کیا جو ظلم و استبداد کے آگے سرِ تسلیم خم کرے۔ وہ شاعری ہی کیا جو اعلیٰ انسانی اقدار کی حفاظت نہ کر سکے۔ وہ شاعری ہی کیا جو مخالف ماحول میں حق گوئی کا فرض ادا نہ کر سکے، وہ شاعری ہی کیا جو فکر و فن کی بلندیوں کو نہ پا سکے۔

اگر شاعری کا یہی معیار ہو سکتا ہے تو ہم نیر صاحب کے مجموعۂ کلام "صنم تراش" میں اس کو کما حقہ پاتے ہیں۔ ثبوت میں چند اشعار ملاحظہ کے لئے پیش ہیں۔ ؎

زندگی کیا ہے ہماری اک شکستہ ساز ہے ۔ سننے والوں کے لئے آواز ہی آواز ہے
رُک گئے قافلے بہاروں کے ۔ کس کے نالے ہیں اتنے درد انگیز
لڑکھڑاتے ہیں روشنی کے قدم ۔ تشنۂ زندگی ہے کتنا تیز
اب بھی ہے دل میں تازگی نیر ۔ اُن کی یادیں ہیں کتنی دل آویز

تم اپنا ہاتھ ذرا سوچ کر بڑھا دینا ۔ بہت سے ہاتھ کٹے ہیں درازدستی میں

کس کو قاتل میں کہوں کس کو مسیحا سمجھوں ۔ سب یہاں دوست ہی بیٹھے ہیں کسے کیا سمجھوں

ساتھ دے وقت تو اے دوست رگِ گل سے بھی ۔ ظلم کی آہنی زنجیر بھی کٹ جاتی ہے

ثبات باطل ہے تو پھر کیوں ہے صداقت گریز ۔ جھوٹ کی عمر تو لمحات میں کٹ جاتی ہے

کلیوں کی زباں کھلتی ہے جب صحنِ چمن میں ۔ پھولوں کا لہو پیتے ہیں گلشن کے نگہبان

جن مقامات پہ جبریلؑ کے پر جلتے ہیں ۔ ایسی راہوں سے بھی دیوانے گزر جاتے ہیں

تنہائی کے عالم میں مرے پاس رہی ہے ۔ وہ یاد جو احساس کے سانچوں میں ڈھلی ہے

(۱۴۔ فروری ۱۹۷۹ء)

ڈاکٹر جلیل تنویر

پھولوں کا شاعر ـ صلاح الدین نیّر

فنکار کی فنکارانہ حِس اور اس کا زاویۂ نگاہ کائنات میں موجود حسن اور آئے دن کے واقعات کو نہ صرف شدت سے محسوس کرتا ہے بلکہ اسی شدت سے اُسے اپنے فن میں سمو کر ایک حسین لفظی دنیا میں تبدیل کرتا ہے۔ قدرتی حسن اور انسانی معاشرت کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا اور انہیں اپنے فن کا موضوع بنانا ہی فن کا بنیادی تقاضا ہے۔

صلاح الدین نیّر حیدرآباد کے ایک ایسے ہی شاعر ہیں جنھوں نے زندگی کے حسن و قبح دونوں کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ قدرت کی رعنائیوں کو انہوں نے شدت سے محسوس کیا ہے۔ حُسن ان کی شخصیت اور فن کا بنیادی عنصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پہلے مجموعۂ کلام کا نام "گلِ تازہ" کی صورت میں منظر عام پر آیا۔ گلوں سے محبت اور ان کی تازگی کو ہمیشہ اپنے قریب محسوس کرنا یقیناً جمالیاتی حِس کا ایک بہترین مظہر ہے۔ 'گلِ تازہ' صلاح الدین نیّر کے ہاں ایک شدید احساس کی صورت ہے اور یہ صورت رفتہ رفتہ ایک علامت کی تشکیل اختیار کر گئی ہے۔ "گلِ تازہ" 'زخموں کے گلاب' 'صنم تراش' 'شکن در شکن' 'خوشبو کا سفر

رشتوں کی مہک، ان کے فن کی ارتقائی تشکیلیں ہیں۔ جہاں زندگی کے مختلف واقعات و حادثات کو فنکارانہ صورتیں حاصل ہو گئی ہیں۔ اور ان کے فن میں خاصہ تنوع اور ہمہ گیری آگئی ہے۔ رشتوں کی مہک، صلاح الدین نیر کا حالیہ مجموعہ کلام ہے۔ جس کا سرورق سُرخ گلابوں سے مزین ہے جو کہ شاعر کے دلی جذبات کا آئینہ دار ہے اور اس کے جمالیاتی زندگی کا غماز بھی ہے۔ ان کی غزل شعور ذات سے نکل کر کہیں کہیں شعورِ کائنات کے وسیع میدان میں داخل ہو گئی ہے۔ شعورِ کائنات کی طرف ان کی یہ ذہنی پیش قدمی ان کے وسعتِ ذہنی اور آفاقیت کا پتہ دیتی ہے

صلاح الدین نیر کی غزلوں کی زبان نہایت شستہ اور سادہ ہے۔ ان کے ہاں ترسیل کا المیہ نہیں پایا جاتا۔ بقول ڈاکٹر مغنی تبسم ' نیر نے ترقی پسندی کی روایت اور جدید تحریک کو ہم آمیز کر کے ایک ایسی زبان تشکیل دی ہے جو ان کے فکر و احساس کا ابلاغ موثر اور بھرپور طریقے سے کر سکتی ہے'۔ خود صلاح الدین نیر نے اپنے بارے میں لکھا ہے کہ "مجھے فطرت کی رعنائیوں کے ساتھ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے بھی پیار ہے۔ زندگی کے تجربات نے مجھے جو کچھ دیا ہے روز و شب کی کشمکش سے جو سوغاتیں ملی ہیں انہیں میں نے نہایت خلوص اور دیانت داری کے ساتھ شعری پیرہن میں ڈھال دیا ہے۔

نیر کی غزلوں میں زندگی کا حُسن بھی ہے اور کربناکی بھی۔ زندگی کی ہر لحہ بدلتی ہوئی اقدار کی مہک انھوں نے قریب سے محسوس کی ہے۔ وہ صرف سماجی عکاسی پر ہی قانع نہیں ہیں بلکہ ایک صالح اور پُرامن معاشرہ کا خواب بھی دیکھا ہے۔ اچھے خوابوں کی تعبیر اور ان کی تعبیر کی تلاش میں نیر نے خود کو ہر لحہ

معروفِ عمل رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

ہر زخم اپنی ذات کا آپس میں بانٹ لیں ۔ ہم میں کم از کم اتنا تو دیوانہ پن رہے

فصیلِ شہر کو جب تک گرا نہیں دیں گے ۔ نہیں یہ لوگ کبھی راستہ نہیں دیں گے

یہ بزمِ شعر و ادب کب کسی کی ہے میراث ۔ جو نسل گونگی ہو ہم جائزہ نہیں دیں گے

جانا تھا جن کو جاچکے میدان چھوڑ کر ۔ ہم جیسے سرفروش ہی لشکر میں رہ گئے

زندگی کی بے یقینی، ناموافق حالات، معاشی وسماجی عدم توازن نے آج ہر شخص کو پریشان کر رکھا ہے۔ ہر لمحہ بکھرنے اور ٹوٹنے کا اندیشہ قلب و ذہن پر مسلط ہے لیکن صلاح الدین نیر کی رجائی حس کبھی مدھم نہیں ہوتی۔ وہ گھپ اندھیروں میں بھی روشنی کے آرزو مند ہیں۔ اور ہر پل چمکتی کرنوں کے تصور سے وہ سرشار رہتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

مدھم ہی سہی شمعیں جلائے ہوئے رکھنا ۔ ہر وقت مرے گھر کو سجائے ہوئے رکھنا

پھولوں کا زمانہ ہو کہ پتھراؤ کا موسم ۔ ہر حال میں تم سر کو اُٹھائے ہوئے رکھنا

میں جلد آؤں گا ساحل پہ گفتگو کے لئے ۔ یقین کیجے یہ دریا بھی پار کرلوں گا

اسی لئے ہی تو ذہنی تھکن نہیں ہوتی ۔ ترے خیال کی خوشبو سفر میں رہتی ہے

غزلوں کے علاوہ صلاح الدین نیّر کے نظم کہنے کا بھی اپنا ایک انداز ہے مختلف موضوعات پر ان کی کہی ہوئی نظمیں اپنے موضوع اور اسلوبِ بیان کے اعتبار سے کافی دلکش ہیں۔ ان میں ایک طرح کی شگفتگی اور روانی کا احساس ملتا ہے۔ ان کا شعری سفر ارتقاء کی طرف مائل ہے۔ انہوں نے یقیناً حیدرآباد کے عظیم شاعر مخدوم محی الدین کے ادبی ورثہ کو نہ صرف تحفظ بخشا ہے بلکہ اس کو چار چاند لگایا ہے۔۔۔

(تبصرہ "سالار" بنگلور) ۱۹۸۷ء

امان اختر

خوشبو کا سفر

خلوص بانٹتا میں سب کے گھر گیا لیکن
تم آج آئے ہو جب میرا ہاتھ خالی ہے

آپ کا یہ شعر آپ ہی سے پربھنی کے ایک مشاعرے میں سُنا تھا اور اب تک ذہن میں اِس لئے محفوظ ہے کہ نہ صرف شعر اچھا ہے بلکہ اِس لئے بھی کہ اولی مصرعہ ایک مُسلّم حقیقت بھی ہے۔ آپ سے گو میری چند ملاقاتیں ہی رہیں وہ بھی پونے کے ایک جشنِ غالبؔ والے کُل ہند مشاعرہ میں اور پربھنی کے کوئی دو تین مشاعروں کی حد تک ہی۔ جب زاہد کمال نے یہ کہا کہ صلاح الدین نیر ایک نہایت ہی پُر خلوص اور دوست نواز شخصیت کا نام ہے تو آپ کے اس شعر کے پہلے مصرعہ کی حقیقت سے انکار کیسے کیا جا سکتا ہے۔ زاہد کمال اکثر حیدرآباد کی محفلوں کا ذکر کرتے رہتے ہیں لیکن دو نام ہی ایسے ہیں جو اکثر ان تذکروں میں وہ ورد کی حد تک دُہراتے ہیں۔ ایک مخدوم محی الدین اور دوسرا صلاح الدین نیّر۔

آپ کے پاس نہ صرف غزل کی بھرپور علامت ہے بلکہ عصری حسیت بھی نمایاں ہے اور یہ حسیت وہ نقلی حسیت نہیں ہے جیسے آج کے کچھ جدید کہلائے

بجانے والے شعراء نے صرف فیشن کے طور پر اوڑھ رکھی ہے بلکہ تمام زندگی کو زندگی کے مسائل کو اور انسانی دردمندی کو محیط کئے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے ہاں ایک خاص بات یہ ہے کہ آپ کے یہاں حیدرآباد کی اس روایتی گنگا جمنی تہذیب کی خوشبو بھی ملتی ہے جو نئی نسلوں کے لئے شائد محض فسانہ عہد گم گشتہ ہی ہے۔

میں خود روایتوں کا عاشق ہوں اور وہ لوگ جو روایتوں سے بغاوت کی باتیں کرتے ہیں میری نظر میں یا تو جھوٹے ہیں یا کم عقل۔ دراصل یہ لوگ روایت اور رسم کے فرق سے نابلد ہیں۔ روایت تو مٹی ہے ' پانی ہے ' غذا ہے ' ہوا ہے اور ان کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر دور اپنی کچھ رسمیں روایتوں کے ساتھ باندھ دیتا ہے اور وہ اس میں ضرور کچھ عرصہ بعد ناکارہ اور غیر ضروری ہو جاتی ہیں۔ اُنہیں بدلا جاسکتا ہے اور بدلنا بھی چاہیئے جو لوگ Non-Commitment کی بات کرتے ہیں ' کسی صورت میں فنکار نہیں ہو سکتے کیونکہ بغیر کسی Commitment کے نہ تو شاعری کی جاسکتی ہے ' نہ کوئی ادب تخلیق کیا جاسکتا ہے۔ نہ کوئی فن ' کوئی پیڑ ' کوئی پودا ہوا میں مُعلق اُگایا جاسکتا۔ آپ کا شعری رویہ ان تمام ارکان اور لوازمات کو پورا کرتا ہے۔

(۱۹۸۴ء)

○

"قومی تنظیم"
پٹنہ

گلِ تازہ

اس دور میں جب آوازوں کو پہچاننا دشوار ہوتا جارہا ہے، اچھے شعراء کی کساد بازاری ہے۔ اور شاعری کی بہتات۔ اگر کہیں تازگیِ فکر و بیان مل جاتی ہے تو بسا غنیمت ہے۔

حیدرآباد کے نوجوان مگر ہونہار شاعر صلاح الدین نیر کی غزلوں کا مجموعہ "گلِ تازہ" قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے کیونکہ اس مجموعہ میں کئی خوبیاں ایسی ہیں کہ جن کو ہم نظر انداز نہیں کرسکتے۔

موجودہ دور کی شاعری ایک طرف حقیقت پسند ہوگئی ہے تو دوسری طرف جنسی توانائی پر زور دیا جانے لگا ہے۔ ایک طرف نئی ہئیتوں کے تجربے کئے جارہے ہیں تو دوسری طرف ابہام پسندانہ رجحان کو فروغ ہورہا ہے۔ دامنِ شاعری کو ان سب آلائشوں سے علیحدہ رکھ کر غزلیں کہنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔

نیر صاحب کی غزلیں اپنے احساس و جذبہ کے پُرخلوص اظہار کی مرہونِ منت ہیں۔ ان میں نیا اندازِ فکر نہیں ہے۔ اور طرزِ بیاں بھی روایتی نہیں۔ اکثر غزلوں کا

۔ عنوانات کا خود شاعر نے ایک خاص خیال رکھا ہے ۔
ب غم جاناں اور غم دوراں سے علیحدہ ہو کر نہیں لکھیں لیکن
اور جگہ بیجا نہیں ہے ۔ شاعر نے اپنی دلی کیفیات کی
ت اور خلوصِ فکر کے ساتھ ۔ اس لئے ان غزلوں میں تازگی
دا ہو گیا ہے ۔ شاعر کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے
ں سے وہ گذرا ہے اُن کا ادراک اُس نے پوری شعوری
ب اخذ و انتخاب کے بعد ان کو شعروں میں پیش کیا ہے ۔
کے بعد گلِ تازہ کے شاعر سے ہمیں بہت ساری توقعات ہوتی
و نظر کا سلسلہ جاری رکھا تو بہت کم عرصہ میں وہ ایک ممتاز
گے ۔

(تبصرہ "قومی تنظیم" پٹنہ)
۱۹۶۶ء

سلطانہ جسٹس شرف الدین احمد

"سلسلہ پھولوں کا"

"سرگذشتِ دل" صلاح الدین نیّر کی کتاب کا پیش لفظ ہے۔ "پیش لفظ" اور "آخری صفحہ" ان کی تحریر کی جان کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں ان کے محسوسات کی آہٹیں، شخصیت کے رنگ، ستھری محبتوں کے اُجالے اور مہر و وفا کے سامنے گذرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنی منہ بولی بہنوں کے قافلے کے میر کارواں معلوم ہوتے ہیں۔ ان بے نام رشتوں کو اگر نیّر تقدیس اور پاکیزگی میں نہ ڈھالتے تو احساس ہوتا جیسے وہ کوئی ہرجائی ہوں۔ جن کے پیچھے ہر عمر والی صنفِ نازک کی طویل قطار سُرخ پھول لئے کھڑی ہو۔ انہوں نے ان رشتوں کے ساتھ شرافت، وفا شعاری اور بے لوث دیانت داری برتی ہے اور صحیح معنوں میں نبھایا ہے۔ وہ اس درجہ حساس ہیں کہ ان لطیف رشتوں کے بانکپن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے تخیل کی وسعتیں اسی بھینی بھینی خوشبو میں بسی رہتی ہیں۔ چنانچہ رقم طراز ہیں۔ "جہاں میں نے اپنی منہ بولی بہنوں کی بے لوث چاہت، محبت، نازبرداری اور پاسداری میں اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ گزارا ہے، وہیں ان کی زندگی سنوارنے اور ان کے بہتر مستقبل کے لئے بھی پُرخلوص کوشش کی ہے۔" عجیب اتفاق ہے میں نیّر کی تقریباً سب ہی منہ بولی بہنوں

اور آپاؤں سے واقف ہوں۔ نیّر نے اپنے خاندانی حالات، خون کے رشتوں اور بے شمار عزیز و اقربا کا تذکرہ جس صاف گوئی اور بے باک صداقت کے ساتھ کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ اپنے وطن ہمناباد کا تاریخی پس منظر، دیہاتی لڑکوں کے مشاغل، دینی تعلیم، درسگاہیں، نذر و نیاز، میلے ٹھیلے اور جاتراؤں کا تذکرہ غالباً نصف صدی قبل کے سماج کا جزو لاینفک تھا۔ بزرگوں کا لحاظ و پاس، عورتوں کی تکریم، یکجہتی کی قدروں کی اہمیت نے نیّر کی اخلاقی اُٹھان اور کردار کو پروان چڑھایا ہے۔ اس اندازِ زندگی نے اپنے اَنمٹ نقش ان پر مرتسم کر رکھے ہیں۔ زمانۂ ملازمت کے اُتار چڑھاؤ، عہدہ داروں سے ان کے مراسم اور ان کی قدرشناسیوں کا بھی تذکرہ ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی بڑی سی تقریب میں شریک ہوں۔ طویل و عریض ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی ہوں۔ حیدرآباد کی ایسی شخصیتیں موجود ہیں جن سے تعارف کی ضرورت نہیں ہے جیسے ایس اے قادر، ہاشم علی اختر، بھارت چند کھنہ غلام احمد، خالد انصاری، تراب الحسن، عبدالمحمود، رشید قریشی، نریندر لوتھر غلام دستگیر قریشی اور حسن الدین احمد۔ ان میں ایسے بھی لوگ ہیں جن سے شناسائی ہے، اور بعضوں سے غائبانہ تعارف۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے وہ ادبی انجمنوں سے نہ جانے کن کن روپ میں وابستہ رہے۔ دامے، درمے، قلمے، سخنے اعانت اور خدمت کی۔ اُردو مجلس، ادبی ٹرسٹ، زندہ دلانِ حیدرآباد، انجمن ترقی پسند مصنفین اور نہ جانے کتنی معروف اور غیر معروف ادبی انجمنوں سے فعال حیثیت سے وابستہ ہیں۔

"روزنامہ سیاست" سے تو ایک اٹوٹ بندھن اور دلی وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔ عابد علی خان اور محبوب حسین جگر سے استاد شاگرد، گرو چیلے اور پیر و مرشد جیسی

عقیدت مندی کا احساس ہوتا ہے۔ شعر و حکمت، شگوفہ، جیسے ادبی رسائل سے بھی
ان کا تعلق ہے۔ اَن گنت شاعروں، ادیبوں، ظرافت نگاروں سے شخصی واقفیت
ہے۔ نہ جانے کتنی ادبی تقریبوں کے کنوینر رہے۔ نظامت کی، شکریہ کا خوشگوار
فریضہ انجام دیا۔ نیّر کی زندگی سپاٹ اور پھیکی نہیں۔ خوبصورت لڑکیوں کے دلکش
چہرے تارِ دل مرتعش کردیتے ہیں۔ حسن کی پرچھائیاں، رہ حیات میں ان کے ساتھ
چلتی رہتی ہیں۔ ایسے کئی حسین سائے شاعری کی تحریک بن جاتے ہیں۔ عظمت آپا اور
صالحہ آپا کی بوقلموں باوقار شخصیتوں نے تعظیم و تکریم اور خلوص کے بے پناہ جذبات کو
اس طرح جگایا کہ گہری عقیدت اِن میں گھر کرگئی۔ وہ ان ہستیوں کو بے اختیار یاد
کرتے ہیں، ان کی یادوں کی چھاپ نیّر کے ذہنی اُفق پر دھندلی نہیں ہوتی۔

"سلسلہ پھولوں کا" خود نوشت ہے۔ آپ بیتی ہے۔ اندازِ بیان سیدھا
سادہ ہے۔ کھرا ہے۔ بناوٹ کا کوئی عنصر اس میں شریک نہیں۔ ادب عالیہ نہ سہی
"آخری صفحہ" اور "سرگذشتِ دل" میں کچھ ایسے محسوسات اور انمول سچائیاں
دکھائی دیتی ہیں۔ جنھیں حساس دل و دماغ بخوشی قبول کرتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

> "ہمیں اپنے معاشرے میں کچھ ایسے لوگ بھی مل جاتے ہیں جو زندگی
> کا حصّہ نہ ہوتے ہوئے بھی زندگی کا اٹوٹ حصّہ بن جاتے ہیں۔ طویل
> فاصلوں پر رہتے ہوئے بھی اپنی قربت کا احساس دلاتے ہیں، جن کی
> سانسوں کی گرمی اور جن کے فکر و خیال کی خوشبو پیراہن جسم و جاں
> کو مہکاتی رہتی ہے۔"

انکی ستھری عبارت اور سیدھی سادی تحریر میں تخلیقی ادب کے شرر بے اختیار دمک اُٹھے ہیں۔

تبصرہ (سیاست۔ ۲۴ رمئی ۱۹۹۲ء)

ڈاکٹر اختر سلطانہ

"عکس در عکس"

میں نے قلم اُٹھایا اور لکھنا چاہا ۔ لیکن سارے الفاظ نہ جانے کہاں گم ہو گئے تھے ۔ اور میرے سامنے تھے چند سادہ اوراق ـــ

میں نے کوشش کی کہ چند ہی کو ڈھونڈ کر مقید کر دوں ۔ بڑی تگ و دو کرنی پڑی ۔ تب کہیں جا کر یہ کچھ قلم کے جال میں پھنس سکے ۔

جس کی نظریں دُور رس، جس کا سخن قند و نبات
اپنی محفل میں ایک ایسا دیدہ ور رکھتے ہیں ہم

اس میں کچھ نظر آ رہا ہے ۔ کچھ نہیں سے کچھ تو بہتر ہے ۔ اب اوراق کو شکایت نہیں کہ وہ سادہ ہے ۔ لیکن آگے ـــ ؟ میں نے پھر نظریں دوڑائیں ۔ ذہن کے پردوں کو چاک کر کے اندر جھانکنے کی کوشش کی ۔ آخر کچھ تو سرمایہ محفوظ ہوگا ۔ اس جگہ سے تو کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا ۔ اور ہوا بھی یہی ۔ وہاں سے جو ہاتھ لگا ۔ وہ تھا ـــ " سفر جاری ہے "

سو تو ہے ۔ لیکن آگے کیا ـــ ؟ آگے کی کون سوچتا ہے ۔ خیر آگے نہیں تو پیچھے ہی چلیں ۔ اور پیچھے جاتے ہوئے ۔ نہ جانے کیوں ۔ " محمود گاواں "

کا "بیدر" سامنے آگیا۔ اور یہ جملہ نظروں کے آگے گھومنے لگا۔

"..... تذکروں میں ایسے خطوں کو مردم خیز کہا جاتا ہے ....."

یہاں بات کچھ بنتی دکھائی دینے لگی۔ دیکھیں تو سہی کہ اس خطۂ زمین کی طرف ذہن کی رو کیوں بہکنے پر مجبور ہوئی ۔ ؟ ہاں! یاد آیا ۔ اسی مردم خیز خطے کے آس پاس سے ۱۹۳۵ء میں ایک "نیّر" طلوع ہوا تھا۔ جس نے ۱۹۶۰ء سے اپنی سنہری کرنیں دنیائے شعر و ادب میں بکھیرنی شروع کردیں۔ آج یہ آسمانِ ادب کا۔ ایک محترم و معتبر نام ہے۔ جس نے قلی قطب شاہ کے "دیارِ سخنوراں" میں رہتے ہوئے گراں قدر ادبی کارنامے انجام دیئے اور کئی اعزازات بھی پائے۔

اس آفتاب کی کرنیں آنکھوں کو چندھیاتی نہیں ۔ نہ اسے نگاہوں کو خیرہ اور چکاچوند کرنے کا شوق ہی ہے ۔ یہ تو بس ۔ ! اپنی خوش نوائی اور نغمہ سنجی سے ۔

ذہن نے کہا ۔ یہ اسکی بلندی ہے۔ منکسر المزاجی ہے، سادگی ہے ۔ اور آگے ۔ ؟ کوئی بات نہیں ۔ اب کاغذ سادہ بھی نہیں۔ اس پر کچھ الفاظ لکھے جاچکے ہیں ۔ اور یہ چیز باعثِ طمانیت ہے ۔ چنانچہ پھر قلم کو ہاتھ میں تھاما ۔ اور ۔ کھوج شروع ہوئی ۔ آنکھیں بندکیں ۔ اور کھولیں ۔ ایک مرتبہ اور ذہن کی گہرائیوں میں ڈوبنے کی کوشش کی ۔ ابتداء میں تو تاریکی ہی سے سابقہ پڑا ۔ لیکن پھر ۔ پھر روشنی کی ایک جھینی سی کرن چمکی ۔ جو دور ہٹتی چلی گئی ۔ جب فکر اُسے سمیٹنے کے لئے آگے بڑھی تو ۔ جانا کہ ۔

وہ تو نہ صرف اپنے دامن میں ۔ "گلِ تازہ"۔ "زخموں کے گلاب"۔ "صنم تراش"

"شکن در شکن" - "رشتوں کی مہک" - "خوشبو کا سفر" - "یہ کیسا رشتہ ہے"
وغیرہ سمیٹے ہوئے ہے بلکہ ساتھ ساتھ سنجیدہ - علمی - فکری قسم کی ادبیات
کے بلند و بالا کہساروں پر بھی اپنی کمندیں پھینک چکا ہے - "عظمتِ دکن" "عظمتِ خیابان"
پھر "سلسلہ پھولوں کا" اور نہ جانے کیا کیا --- ؟ جس نے خود تو بہت کچھ لکھا -
لیکن اس پر بہت کم لکھا گیا --- اہم تخلیقی کتابوں کا یہ خالق اور مرتب --- گو
اُسے راہیں دلفریب بھی ملیں اور پُرخطر بھی - بعض زمینیں خشک و بنجر بھی تھیں -
اور سفر کٹھن - مشکل و بے کیف بھی - لیکن اُس نے ہم سفر کو یہ احساس نہیں ہونے
دیا کہ اِن دشوار گذار راہوں سے وہ کس قدر حیلہ اور کس آسانی سے گذار لئے جانے
کی صلاحیتِ خداداد اپنے میں رکھتا ہے --- اظہار میں نہ سختی موجود --- نہ کرختگی کا
وجود --- زمین کتنی ہی دشوار گزار کیوں نہ ہو --- زبان صاف و شستہ اور آئینے کی
طرح مجلا و شفاف --- سیدھے سادے الفاظ کا دریا ہے کہ سُبک رفتاری سے
اُمڈا چلا آتا ہے - جس کی گہرائیوں میں مطالب کا جہاں آباد ملتا ہے - رنگ آبی
پینٹنگ کی طرح ہلکے پھلکے - لہجہ مدھم اور مانوس - یہ نہ میر کی زبان ہے - نہ غالب
کا بیان --- یہ ذوق کا طرفدار بھی نہیں - نہ ہی یہ مومن کا شناخوان ہے - اس کا
انداز تو کچھ اور ہی ہے - جیسے پھولوں کی رہ گذر کہہ سکتے ہیں - جہاں مہک ہے
تازگی ہے اور --- اور خوشبو بھی -

ذہنی رَو نے یہاں تک تو ساتھ دیا - لیکن آگے --- ؟ اس مقام پر
پہنچ کر سامنے پھر سوالیہ نشان موجود تھا --- اور ورق کا اگلا حصہ --- جیسے چلا چلا
کر کہہ رہا تھا - ابھی میں سادہ ہوں --- اور ہاتھ آئی ہوئی کرن - یوں محسوس

ہو رہا تھا کہ طنزیہ انداز میں مسکراتی ہوئی دور ہٹتی جا رہی ہے ـــ الفاظ کا پھر کہیں پتہ نہ تھا ـــ

میں نے پھر نظریں دوڑائیں کہ اب اگلا قدم کس جانب اٹھاؤں ۔ اور کیا تدبیر کیا کروں کہ الفاظ پھر گرفت میں آ سکیں ۔ میں نے آنکھوں کو سمیٹا اور پھیلایا ـــ پھیلایا اور سمیٹا ـــ اور فکر کی گرفت میں یہ الفاظ تھے ـــ

شعری ادب میں گراں قدر اضافہ کرنے والی یہ ہستی ـــ یہ کون سی نئی بات ہے ۔ یہ تو ادبی زبان کا وہ جملہ ہے ـــ ہاں ! ـــ ہاں ! رُک کیوں گئے آگے بڑھو ـــ ہاں ! ـــ تو یہ ہستی ـــ نہیں اس ہستی سے ملنے والا ـــ پہلی ملاقات میں یہ انمٹ تاثر لے کر اٹھتا ہے کہ ـــ خلوص کا پیکر ۔ شائستگی کا نمونہ ـــ حد درجہ خلیق و خوش اخلاق ہیں ۔ بس اتنا ہی ـــ ؟ کچھ اور آگے بڑھیئے ـــ کچھ اور سوچیئے ـــ کچھ اور کہئے ـــ محبت کے مسلک پر کاربند رہنا ـــ انکی شخصیت کا مستقل رویہ ہے ـــ ایک سیاح کی مانند ہمہ وقت حالتِ سفر میں رہنا مرغوب ـــ ہم ادب سے ملتے ہیں ـــ اور وہ ـــ بزرگانہ شفقت سے ـــ ٹھیک ہے ـــ یہ خصوصیت تو کم و بیش سب میں موجود ہوتی ہے ـــ اچھا ـــ تو اس سے یہ ـــ کچھ زیادہ ہی بہرہ ور ہیں ـــ ہاں ! ـــ آگے بڑھو ـــ کیا یہیں رُک جاؤ گے ـــ ؟

ہر ایک کے تقاضے جدا جدا ہیں ـــ لیکن ان کا رویہ بھی جداگانہ انداز کا ہے ـــ ہر ایک فرمائش کسی نہ کسی طرح پوری کرتے ہیں اور دوسروں کو خوش کر کے خود مطمئن ہو جاتے ہیں ـــ

نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پرواہ

اچھے جا رہے ہو — لیکن یہ کیا — ؟ ذرا سی تعریف کی کہ پھسل پڑے — اور یہ جا — وہ جا — ! نہ جانے پھر سب کہاں گم ہو گئے — ؟ اور ورق پر — پھر سفیدی کا راج نظر آ رہا ہے — کہیں سے تو لاؤ الفاظ کو ڈھونڈ کر — اگر یہی سست رفتاری رہی تو — زمانے کا سیلاب — سب کچھ بہا لے جائے گا — کیا کہا — ؟ زمانے کا سیلاب — زمانہ — انہیں نہیں بہا سکتا — ان کے قدم بڑی مضبوطی سے اِس وقت کی۔ اس زمانے کی زمینوں میں پیوست ہو گئے ہیں —

نظریں پھر بھٹک رہی ہیں — کچھ نہ کچھ تو ڈھونڈ ہی لائیں گی — کچھ نہیں تو — چہرہ کی ایک جھلک — یا کچھ نقوش ہی — ادھورے ہی سہی — کچھ نہ کچھ تو ڈھونڈ لانے میں یہ ضرور کامیاب ہونگی —

درمیانہ قد — سیاہ شیروانی — سفید بے داغ پائجامہ — آراستگی سے بے نیاز سیاہ بال — تاباں چہرہ — جس پر کبھی کبھی کھیل جانے والی مخصوص مسکراہٹ — ستواں ناک — جس کی دونوں جانب سے جھانکتی ہوئی گہری نیلی آنکھیں — گویا آنکھیں نہ ہوں۔ خلوص و شفقت کا موجیں مارتا سمندر ہو۔ جیسے وہ لاکھ چھپانا چاہیں نہیں چھپ سکتے — منکسر اور دوست نواز — جانے کیسے کیسے لوگ چلے آتے ہیں — ملنے — مدعو کرنے — کچھ خدمات تفویض کرنے — اور بور بھی کرنے — لیکن یہ ہیں کہ —

" ہم کفر جانتے ہیں دل توڑنا کسی کا "

ـــــ قاش قاش کر کے خود کو بانٹنا کوئی ان سے سیکھے ـــ اور آگے ۔ ؟
نیّر اور شاعری ـــ صحافت اور نیّر ـــ دریا کے کنارے لیکن
دور تک ہم سفر ـــــ

اور ـــ ؟ نہ جانے الفاظ پھر کہاں کھو گئے ـــــ ؟ یا ـــ گُم ہو گئے ۔
ذہن کی بوجھل تہیں ـــ کُھرچ کُھرچ میں نے چاہا کہ اور آگے بڑھوں ۔ لیکن
ـــ اب وہاں کچھ نہیں ۔ اوراق ۔ حرف اتنے ہی الفاظ سے رنگین ہو سکے ہیں
۔ اور یہ سادہ ورق ـــ ؟ "سفر جاری ہے "۔ "سلسلہ پھولوں کا"
الفاظ گم ہو چکے ہیں ۔ نظریں متلاشی ہیں ـــ ذہن اور فکر کی پرتیں ؟ ـــ یہ چند
اوراق ـــ ان میں سے کچھ پر کچھ الفاظ لکھے جا چکے ہیں ـــ جو "نذر" کرنے کی
گستاخی کر رہی ہوں ۔ سورج ـــ ؟ مہر ـــ ؟ آفتاب ـــ ؟ نیّر ـــ ؟
ـــ نہیں نیّر بھائی (صلاح الدین نیّر) کی خدمت میں ـــــ
گر قبول . . . . . ؟

ڈاکٹر صابرہ سعید

آفاق کا مترجم

بودلیر نے شاعروں کو آفاق کا مترجم کہا تھا۔ کیونکہ وہ مظاہر قدرت سے وابستہ تارے۔ بادل۔ سمندر۔ پہاڑ۔ ان سب کی زبان کو انسان کی زبان میں بدلنے کا کام کرتے ہیں۔

ان صفحات پر پیش نظر، آفاق کا ایک مترجم ہی ہے جو زندگی میں کم اور کتابوں میں زیادہ موجود ملا، جس کی تخلیقات کے بارے میں اندازہ ہوا کہ یہ اس کے اپنے ماحول کی دین ہیں۔ جو اُس کے گرد و پیش ہی سے اُبھری ہیں۔ اُس نے اپنی فنی عمر کے اوائل سے اب تک کا سفر جو ایک طویل سفر ہے، کسی کی تقلید یا پیروی سے گریز کر کے نہایت برق رفتاری سے طے کیا۔ بہت کچھ تخلیق کر چکے ہیں، لیکن آج بھی قلم میں وہی دلکشی، گداز اور تازگی ہے جو ابتدا میں تھی۔ زبان رواں اور سادہ، قاری اور سامع پر ایک ان مٹ تاثر چھوڑتی ہے۔

اس ہستی کا وجود سراپا تخلیق اور اشعار اس کا سرمایۂ حیات ہیں، کیونکہ یہ وادی اس کی اپنی وادی ہے۔ شاعروں اور مصنفوں کی طویل قطار میں آج وہ

ایک ایسے بلند مقام پر کھڑے ہیں کہ ادبی اُفق پر اُنہیں بآسانی دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک ایسا شخص کہہ سکتے ہیں جس کی سرخ روشنی آنکھوں کو خیرہ نہیں کرتی لیکن اپنے آپ میں مگن، جگمگائے جانے کے شغل کو جاری رکھے ہوئے ہے۔

آٹھ (۸) شعری مجموعوں کا خالق (۳۲) کتابوں کی ترتیب و تزئین کرنے والی یہ نامور ہستی صلاح الدین نیّر (اور میرے لئے صرف نیّر بھائی) کی ہے جنھیں میں نے جب بھی دیکھا تازہ دم محسوس کیا۔ بے حد چست، ہر وقت سرگرم اور مصروف، ایک پل بھی اُنھیں خالی بیٹھنا منظور نہیں، جب بھی ملے نشستوں، جلسوں سیمیناروں۔ مشاعروں وغیرہ وغیرہ میں معتمد کے کنوینر کے اور نہ جانے کن کن فرائض کا بارِ گراں اُٹھائے ہوئے۔ یہی نہیں منہ بولی بہنوں سے انھیں جتنی دلی محبت ہے اور اُن کے چھوٹے بڑے کاموں کی ادائیگی کو جس طرح وہ اپنا فرضِ اولین سمجھ کر کرتے ہیں، اسی قدر بھائی کے رشتے کا پورا پورا حق وصول کرنے میں بھی یہ اتنے ہی ماہر ہیں۔

وہ اس طرح کہ ــــ فلاں دن کے لئے ایک ریڈیائی تقریر تیار کرلو۔ فلاں تاریخ کو ٹی۔ وی کے ایک سمپوزیم میں شرکت کرنی ہے ــ یا ــــ فلاں محترمہ کی کتاب کی رسم اجراء ہے تمہیں کنوینر کے فرائض انجام دینے ہیں ــــ فلاں کا یوم ــــ منایا جارہا ہے، میں نے تمہارا نام بھی ــ شامل کردیا ہے لیجئے صاحب قلم چلا کرتا تھا۔ کالج کے زمانے میں، جب کہ تحقیقی مقالہ لکھ رہی تھی ــــ اب قلم چلتا ہے، طالب علموں کے امتحانی پرچوں پر ــــ لیکن نیّر بھائی کی حوصلہ افزائیوں کا نتیجہ دیکھئے کہ ان ہی کے لئے قلم کے تیر چھوڑنے

کا خوشگوار فرض بھی مجھ پر عائد کر دیا گیا۔ یوں لگتا ہے وہ میرے سامنے ہیں۔ کسی محفل، کسی مشاعرے، کسی انجمن میں مجھے وہ دروازے کی اوٹ یا دروازے کے قریب اپنی موجودگی کا احساس دلائے بغیر خاموش مسکراتے ہوئے بیٹھے نظر آ رہے ہیں۔ اب اگر یہ قلمی تیر انھیں ہی زخمی کریں تو صاف یہ کہہ کر چھوٹ جاؤں گی کہ یہ تو اُستاد ہی کے دکھلائے ہوئے نقشِ قدم ہیں

جیسا کہ میں نے قبل ازیں تحریر کیا ہے کہ میں نے انھیں ان کی کتابوں میں زیادہ موجود پایا ہے۔ "سلسلہ پھولوں کا" ان کی اپنی خود نوشت ہے جس میں انھوں نے ماضی سے مواد اکٹھا کیا ہے اور ایک آزاد ناظر کی طرح اپنے محسوسات اور لطیف کیفیات جن سے ان کا باصرہ متاثر ہوا پیش کر دیئے ہیں۔ یہی نہیں اپنی زندگی کے مشاہدات کو اس خوبی سے الفاظ کا جامہ پہنایا ہے کہ مستقبل میں بھی حال کی روح کے تحرک کو بآسانی محسوس کیا جا سکے گا۔ گو الفاظ اکہرے اور سادہ مفہوم کے حامل ہیں لیکن نپے تلے اور موزوں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ تفصیل کا بار اُٹھانا نہیں چاہتے، اپنی تخلیقات میں انھوں نے جس فرد کی بھی تصویر کھینچی ہے اُس کے ظاہری و باطنی حقیقی خدوخال اُجاگر کر دیئے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک خاص بات بھی ان کی تحریر میں موجود ہے وہ یہ کہ نقش چاہے کسی کا بھی ہو ان کی اپنی شبیہہ بھی اس میں موجود ملتی ہے۔

حیدرآباد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ شاعروں، ادیبوں، محبت کرنے والے مہمان نوازوں کا شہر ہے۔ وہ حیدرآبادی تہذیب کا مکمل نمونہ نظر آتے ہیں۔

نرم گفتار۔ خوش مزاج ۔ سیدھے سادے ۔ نیک سیرت ۔ یہ خفا بھی ہوتے ہیں اور
انھیں غصہ بھی آتا ہے ۔ اگر انھیں کسی بات پر غصہ آجائے یا کوئی بات ناگوار
گذرے تو خاموشی سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ وضع دار اتنے کہ دوسروں کی زیادتی
کو بھی خاموشی سے برداشت کر لیتے ہیں۔ جب پیمانۂ صبر لبریز ہو کر چھلکنے کے قریب
ہوتا ہے تو ایسے شعر زیر قلم آتے ہیں ؎

جہاں چھوڑا تھا مجھ کو زندگی نے — ابھی تک اُسی دورا ہے پہ کھڑا ہوں

اسکی وجہ شائد یہ ہے کہ ان کی زندگی کا زیادہ وقت اسی شہر میں گذرا ہے اور
یہاں کی آب و ہوا کے خاص اوصاف جو اس شہر سے مختص ہیں ان میں سما گئے ہیں ۔
شخصیت میں بھڑک ہے نہ دکھلاوا ۔ مزاج میں بے انتہا خلوص ۔ سادگی اور حقیقت پسندی
کا عنصر بھی کچھ کم نہیں ۔ ساتھ ساتھ گداز دل کے مالک ہیں ۔ یہی نہیں وہ بے لوث
خدمت گذار بھی ہیں ۔ اگر کوئی چاہے بھی تو ان کی کرم فرمائیوں اور حسن سلوک کا
حساب نہیں کر سکتا ۔ خوبصورت چیزوں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے اور کشش حسن
سے متاثر ہوتے ہیں، جس کا اعتراف بھی کیا ہے ۔ صداقت، حق گوئی اور بے باکی
بھی ان کی زندگی کے ہر شعبہ میں ملتی ہے، دوست نواز ہیں ۔

زبان و بیان کی فضائیں لامحدود ہیں، اشہب قلم دوڑنے لگے تو اس کو روکنا
آسان نہیں ہوتا ۔ اب صرف ایک آخری دعائیہ جملہ اور لکھوں گی ۔

" یہ نام شعری دنیا میں ہمیشہ زندہ رہے —— "

○

شفیعہ قادری
لکچرار اُردو، شاداں کالج

ہم سب کے چہیتے شاعر۔ صلاح الدین نیرؔ

نیرؔ بھائی کی شخصیت پر روشنی ڈالنا میرے لئے یوں بھی آسان ہے کہ یہ میرے چہیتے بھائی ہیں۔ انہیں میں نے دیکھا ہے، محسوس کیا ہے۔ انہیں میں خوب جانتی ہوں نیرؔ بھائی سراپا ادبی شخصیت ہیں۔ لگتا ہے اِن کا وجود ہی ادبی خدمات کے لئے ہے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصّہ نہ صرف خود کی بلکہ لوگوں کے مختلف ادبی مصروفیات کی نذر ہو جاتا ہے۔ جب گھر لوٹتے ہیں تب بھی ادبی کاموں میں اُلجھے رہتے ہیں۔ گھر لوٹتے ہیں تو ایک مسکراتی ہوئی نظر سب پر ڈالتے ہوئے بے نیازی سے اپنے کام میں کھوئے کھوئے رہتے ہیں۔ ان میں ہمدردی اور جذبۂ خدمت کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ احساسِ ذمہ داری بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ تب ہی دور و نزدیک کے ادبی دوست واحباب ان پر پوری اجارہ داری و حق کے ساتھ اپنے ادبی کاموں کی ذمہ داری سونپ کر بالکل بے نیاز ہو جاتے ہیں، اور نیرؔ بھائی پوری ایمانداری و خلوص کے ساتھ ان کاموں کی انجام دہی میں لگے رہتے ہیں اور جب کبھی بھی لوگوں کو اپنے ادبی کاموں کی یاد آتی ہے اُنہیں وقتاً فوقتاً پورے حق کے ساتھ ان کاموں کی جلد تکمیل پر اصرار بھی کیا جاتا ہے اور نیرؔ بھائی خواہ مخواہ شرمندگی محسوس کرتے ہوئے

مزید تن دہی سے ان کاموں میں جٹ جاتے ہیں ۔

نیّر بھائی میں غیر معمولی انتظامی صلاحیت موجود ہے۔ بلا کے محنتی انسان ہیں۔ یہ شہر حیدرآباد کی کئی ادبی محفلوں کے روحِ رواں ہیں۔ اخبار سیاست کے ادبی کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اس کے ادبی و شعری کاموں میں تعاون کرتے ہیں۔ ہر ماہ بڑی کامیابی کے ساتھ اُردو مجلس کے ماہانہ جلسہ کا انتظام یہی کیا کرتے ہیں۔ محفلِ خواتین کی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ مکتبۂ شعر و حکمت کے معتمد ہیں ہندوستان گیر شہرت کے حامل ادبی ٹرسٹ اور شنکرجی میموریل سوسائٹی جیسے عظیم مشاعروں کے انتظامات کی ذمہ داری بھی قبول کرتے ہیں۔ حیدرآباد میں جو بھی اہم ادبی محفل کا جلسہ ہو، لوگ ان کی خدمات سے استفادہ حاصل کرتے ہیں۔ ریڈیو، ٹی۔ وی کے مشاعروں کے انعقاد میں بھی تعاون کرتے ہیں۔ بنا تھکے مکمل دلچسپی و خوش دلی کے ساتھ ہر ذمہ داری کو نبھاتے ہیں۔ آئے دن بہت سے لوگ اپنے کاموں کے سلسلے میں ان سے ملتے ہیں اور یہ پیشانی پر کوئی بل لائے بغیر ان کے ساتھ تعاون کرتے ہیں ۔

نیّر بھائی کی شاعری میں غمِ جاناں کا احساس زیادہ ملتا ہے مگر ان کے شب و روز کو دیکھیں تو عملی طور پر یہ غمِ دوراں میں گھرے نظر آتے ہیں۔ ہاں یہ دیکھ کر اور بھی تعجب ہوتا ہے کہ اکثر شاعر اپنے گھر سے بے نیاز، اپنی خیالی دنیا میں گم ہوتے ہیں مگر نیّر بھائی اپنی گھریلو ذمہ داریوں سے بے نیاز نہیں رہتے۔ شاعروں کی مشہور صفت افلاس و تنگ دستی کے برخلاف نیّر بھائی بے حد خوشحال اور معاشی اعتبار سے مستحکم شاعر ہیں۔ ان میں محبت کا جذبہ بھی بہت ہے۔ برادرِ بلند

دل پایا ہے، شاعر جو ہوئے۔ چھوٹے بڑے، اپنے پرائے سبھی سے محبت کرتے ہیں، ہمدردی کرتے ہیں۔ یہ خوددار بھی بہت ہیں۔ انا پسندی میں ان کا جواب نہیں۔ وضع داری ان کا خاص وصف ہے۔ غضب کے خود اعتماد بھی ہیں۔ نیر بھائی میں کچھ کمزوریاں بھی ہیں، کبھی کسی سے ناراض ہو جائیں تو بخشتے نہیں۔ ان میں زندگی کا بڑا حوصلہ ہے۔ زندگی میں آگے بڑھنا جانتے ہیں۔ ہر چیز کو حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ہارنا، پیچھے ہٹنا جانتے ہی نہیں۔ ادبی زندگی کے مراحل یہ اپنی محنت سے طے کر کے اِس مقام پر پہنچے ہیں۔ ان کی ادبی شخصیت کو نکھارنے میں، اسکی تعمیر میں ان کی اپنی ایماندارانہ محنت، صلاحیت، حوصلہ پنہاں ہے۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ شاعر کو شعر کہنے کیلئے مخصوص فضا، مخصوص ماحول درکار ہے لیکن نیر بھائی کے لئے یہ ضروری نہیں۔ یہ تنہائی ہو کہ ہنگامہ، کبھی بھی کہیں بھی بیٹھ کر موڈ بننے پر شعر کہہ لیتے ہیں اور مسلسل کہتے ہیں۔ کسی بھی کٹھن موضوع پر مسائلی ہو کہ رومانی بڑی آسانی اور روانی سے شعر کہہ لیتے ہیں۔ ان کی شاعری کے بارے میں یہ کہوں گی کہ یہ جو کچھ بھی کہتے ہیں ان کے پیچھے ان کے اپنے سچے جذبات ہیں۔ ان میں ان کے تجربات ہوتے ہیں۔ اس میں ان کے خلوص کی آنچ ہے، گرمی ہے۔ ان کے اپنے مشاہدات ہیں، ان کی محبت، ان کی محرومی، ان کا غم، ان کی خوشی بھی شامل ہے۔

غرض نیر بھائی صبح و شام علمی و ادبی کاموں سے وابستہ ہو کر رہ گئے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ ان کاموں سے انہیں تازگی ملتی ہے، شادابی ملتی ہے۔

--

فاطمہ تاج

"بہ اندازِ عقیدت"

فصیلِ شہر کو جب تک گرا نہیں دیں گے
ہمیں یہ لوگ کبھی راستہ نہیں دیں گے

فصیلِ شہر کو گرا کر راستہ بنانے والے مسافر بہت کم ہوتے ہیں۔ "بادِ صبا کی طرح چھو کر گذرنے والی نگاہ کا سلسلہ" ایسے ہی لوگوں سے جا ملتا ہے۔ "ماضی" کے ٹوٹے ہوئے مکانوں پر یہ لوگ اپنے "حال" کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اعزاز کو بھی خیرات سمجھتے ہیں۔ ان کی شانِ بے نیازی، کسی بھی عطا کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتی، کسی کے لئے کائنات چھاننے والوں کی خودی بے مثال ہوتی ہے وہ بڑی شان سے کہتے ہیں ؎

اپنی گرفت میں رہے لمحاتِ زندگی
حالات کا شکار کبھی ہم نہ ہو سکے

صلاح الدین نیّر صاحب ایک مثالی اور غیر معمولی کامیاب شاعر ہیں۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام "گلِ تازہ" کئی برسوں کے بعد آج بھی "گلِ تازہ" ہی لگتا ہے۔ گلِ تازہ کی طرح مہکتے رنگین شعر زندگی کی بہار و خزاں کی طرف اشارہ کرتے

ہیں۔ ان کے کئی شعروں میں "گلِ تازہ" کا ذکر ہے۔ مثال کے طور پر سہ

ہم تو صحرا نصیب ہی ٹھہرے ۔ تیرا کیا ہو گا اسے "گلِ تازہ"
تجھے کس نام سے آواز دوں میں اے گلِ تازہ ۔ یہاں کا ہر شگفتہ گل ترا ہم نام ہوتا ہے
رسوا نہ بہاروں میں رہے گا نہ خزاں میں ۔ نیرّ "گلِ تازہ" کی امانت مرا فن ہے
کھل کے کہو، نزدیکِ رگِ جاں وہ "گلِ تازہ" کیا تو نہیں۔ کس کے لئے کہتے ہو نیرّ ایسے درد بھرے نغمات
مجھ پہ احسان ہی احسان سہی اب میں کہاں سے لاؤں ۔ وہ "گلِ تازہ" جسے بادِ صبا مانگے ہے
موسمِ گل میں بھی نیرّ میں تہی دامن رہا ۔ سب ہیں گلشن میں مگر میرا "گلِ تازہ" نہیں
کیسے کیسے پھول دیکھے ہم نے گلشن میں مگر۔ اس "گلِ تازہ" کی خوشبو کے سوا کیا یاد ہے

لگتا ہے "گلِ تازہ" ہی ان کی ابتدائی شاعری کا مرکز ہے۔ کامیابیوں اور ناکامیوں کے بغیر شاعری کی شرط پوری نہیں ہوتی اور نہ ہی تکمیل ہوتی ہے۔ ان کا اپنا شاعری کا دور خود اپنی ایک تاریخ مرتب کر چکا ہے۔ اُردو ادب میں انھوں نے اپنی علیحدہ تاریخ بنائی ہے، مختصر اور طویل سب ہی لمحوں کو انھوں نے لفظوں میں ڈھالا ہے، حُسنِ ترتیب کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ اشعار موتی کی طرح شفاف و چمکدار لگتے ہیں۔ کچھ اشعار خاص طور پر یہاں لکھنا چاہوں گی، وہ یہ ہیں۔ سہ

احسان کہاں پھولوں پہ شبنم نے کیا ہے ۔ یہ جرم بھی اک دیدۂ پُر نم نے کیا ہے
شعورِ غم سلامت، زندگی کی یہ علامت ہے ۔ مقابل درد کے تنہا دل ناکام ہوتا ہے
ہم عمر بھر سمجھتے رہے جن کو خوشگوار ۔ لمحے وہی ہیں عارضۂ دل بنے ہوئے
تلاطم خیز طوفاں ہو کہ آثارِ لبِ ساحل۔ فضائے بے یقینی میں سفینہ ڈوب جاتا ہے

پوچھے گا کون جا کے فقیہانِ شہر سے ۔ کس کو سزا ملی ہے گنہ گار کون تھا
تسکینِ نظر کے لئے اک عمر پڑی ہے ۔ تہذیبِ نظر کے لئے ایک پل نہ ملے گا
تم کو آزادیٔ پرواز مبارک نمیّر ۔ جو گذرتی ہے تہہِ دام تمہیں کیا معلوم
شمعِ احساس کی لَو اور ذرا تیز کرو ۔ دور رہ کر بھی قریبِ رگِ جاں ہیں کچھ لوگ
سفر زمین کا یارب کہاں تلک ہوگا ۔ سمندروں سے بھی آگے نکل گیا ہے کوئی
فرش پر چلتے ہی نمیّر پاؤں زخمی ہو گئے ۔ آئینوں کے گھر میں جانے کون بکھرے گیا
اتنی ہی نمیّر ہے بس میرے سفر کی داستاں ۔ گھر جو ٹوٹا پاؤں میں زنجیر پہنائی گئی
ہر قدم پر نظر آتی ہیں لہو کی بوندیں ۔ ہو نہ ہو شہرِ وفا کی یہی سرحد ہوگی

ان کے کلام میں حالات کے وہ نشیب و فراز بھی ہیں جہاں سے اس مسافر شاعر کو گذرنا پڑا۔ "گُلِ تازہ" کی خوشبو کے علاوہ ماحول کی چبھن بھی محسوس ہوتی ہے۔ کلام کے شاداب شجر پر ایک پتہ بھی زردی مائل نظر نہیں آتا۔ کہیں محسوس نہیں ہوتا کہ بھرتی کا کوئی شعر یا مصرعہ انہیں لکھنا پڑا ہو۔ شعروں کی روانی میں حقیقتوں کے گہر صاف دکھائی دیتے ہیں، خود کو خادمِ ادب کہتے ہیں، محفلوں میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں، نومشق شاعروں کی سرپرستی بھی کرتے ہیں ترنم اچھا ہی نہیں بہت اچھا ہے۔ ان کا نعتیہ کلام بھی بہت شاندار ہے۔ ان کے نعتیہ کلام میں بقول علامہ اقبال "سادہ لوح بندے" اور "بیچارے مسلمان" کی دلی کیفیات کے اسرار بھی قارئین پر کھلتے جاتے ہیں۔ چند نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہر سانس میں رہتا ہے سفر عرشِ بریں کا ۔ کب فرش پہ رہتے ہیں غلامانِ محمدؐ
کب مدینے سے تہی دست پلٹ آیا ہوں ۔ نقشِ پا آپؐ کے پلکوں پہ اٹھالایا ہوں

فاصلے ہوتے ہیں طے کون و مکاں کے نبیؐ تمہ۔ جیسا نظر گنبدِ خضرا پہ ٹھہر جاتی ہے
خوشبو کا ایک جھونکا مدینے کی سمت کا۔ رحمت نواز بن کے مسلسل سفر میں ہے
نبیؐ کے نورِ مسلسل کا فیض ہے نبیؐ تمہ۔ ازل سے میری طبیعت میں جو اُجالا ہے
آنکھوں میں لئے حسرتِ دیدارِ محمدؐ۔ میں کب سے مدینے کی طرف دیکھ رہا ہوں
رسولِ پاکؐ کی سیرت کا ایک اک لمحہ۔ کھلی کتاب ہے تفسیرِ آگہی کے لئے
کرم نبیؐ کا بہت کچھ ہے چشمِ تر کے لئے۔ بہت ہے خاکِ مدینہ میری نظر کے لئے
ملا رہا ہوں نظر دیدہ ور زمانے سے۔ اُٹھا ہوا ہوں حبیبؐ سے محمدؐ کے آستانے سے
جہاں پہ شاہوں کے سر خم ہو گئے ہیں۔ اُسی نگر میں ادنیٰ سا گدا ہوں
"یہ کیسا رشتہ ہے" مجموعۂ نظم میں اسی عنوان سے ان کی پہلی نظم

ہے۔ ملاحظہ ہوں، چند مصرعے۔

نہ جانے نام ہے کیا اُس لطیف رشتہ کا
کہ جس کے پانے کو اک عمر بھی مری کم ہے
کہ جس کی دید کو آنکھوں میں روشنی کم ہے

رشتوں کے نام اُن سرابوں کی طرح ہیں جو صرف پیاس کی شدت اور صحرا کے سفر
میں نظر آتے ہیں، رشتے معنوی اعتبار سے صرف رشتے ہیں لیکن وہ احساس جسے
محبت کہا جائے بغیر کسی رشتے کے زمینِ دل میں اُگنے والے خود رو پودوں کی طرح
ہے۔ چونکہ شاعر حساس ہوتا ہے اس لیے لفظوں کا سہارا لیتے ہوئے کہیں نہ کہیں
یہ چونکا دینے والا سوال کر بیٹھتا ہے۔ کبھی چاہتے ہوئے اور کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی
بہت سی باتوں کا اظہار ہو جاتا ہے۔ "اسم توسیعی" کے ہر بند میں اپنے چارگی و

مجبوریوں کا احساس بھرا ہوا ہے۔ "گلِ تازہ" نظم، گلِ تازہ کی طرح بہار کا احساس دلاتی ہے، ہر لفظ سے مہکا ہوا ہر مصرعہ حقیقت کا رنگ لئے ہوئے ہے اس لئے قاری بھی اپنے دل میں کھٹک محسوس کرتا ہے، خاص طور پر اس مصرعے سے نہ صرف عہدِ وفا ظاہر ہے۔ بلکہ ایک عزم، ایک ارادہ جو گردشِ دوراں کے اُن پہاڑوں سے ٹکرانے کی صلاحیت کا آئینہ دار ہے جو انسان کو ہر قدم پر زندگی کے راستوں میں ملتے ہیں۔ ؎

تمام عمر سلگتا رہوں گا چھُپ چھُپ کر
میں جل بھی جاؤں گا لیکن دھواں نہ اُٹھے گا

"گلِ تازہ" یقیناً کوئی ایسا پیکر ہے جو شاعر کے خوابوں کی تعبیر رہا ہو اور ایسا لگتا ہے جیسے یہ خواب ادھورا ٹوٹ گیا ہو۔ "تیمار داری" کا ایک مصرعہ ؎

"شریکِ غم ہو مگر درد جانتے ہی نہیں"

اور پھر ؎

مرے ندیم ہیں آدابِ عشق ہی ایسے ۔ نہ کھُل کے ہنستے ہیں وہ اور نہ کھُل کے روتے ہیں

قاری کے دل میں کئی نشتر سے چبھتے محسوس ہوتے ہیں۔ "ایک رات کا مہمان" اور "آنسوؤں کی برات" سے بھی سچائی جھلکتی ہے۔ پھر "ایک پل کے لئے"

؎ "تمام عمر کا حاصل مری گلِ تازہ" جیسے مصرعے نے اُس مرکزِ شاعری کا پیکر بھی ہمارے تصور میں بسا دیا ہے۔۔۔۔ "انتساب" کے بعد "روشنی کی شہزادی" بھی ہمارے سامنے جلوہ گر ہے جس سے شاعر سوالیہ انداز میں مخاطب ہے ؎

یہ کیسا رشتہ ہے تم دور بھی ہو، پاس بھی ہو۔ عجیب ربطِ مسلسل ہے تشنگی کی طرح
"بھیگی پلکیں" اس نظم کے مطالعے کے بعد قاری کی پلکیں بھی واقعتاً نم ہو جاتی ہیں
رہی سہی کسر "اور کیا ملا مجھ کو" کا یہ شعر پوری کر دیتا ہے ؎

زمانے والے اندھیروں سے بڑھ کے کیا دیتے
مری نگاہوں میں تھی جتنی روشنی لے لی

زمانے کے دیئے ہوئے زخموں کا اظہار بڑی بے باکی سے کیا گیا ہے ؎
بہت سے زخم دیئے ہیں مجھے زمانے نے ۔ میں تم سے کچھ نہ چھپاؤں گا وقت آنے دو
"وہ آج تک بھی پیاسا ہے" پیاس کی شدت اس شعر سے چھلکتی ہے ؎
تمہیں خبر نہیں اب اسکے خشک ہونٹوں پر ۔ لرز رہے ہیں حوادث کے کتنے پیمانے
"بازگشت" کے علاوہ "کہاں ہو تم" ؎

تم ایک ایسی امانت ہو میرے ماضی کی
کہ جس کو بھیگتی پلکوں میں اب چھپائے ہوئے
نہ جانے کس کے لئے شہر شہر پھرتا ہوں
نہ چھینو مجھ سے کبھی اعتماد کی دولت
بھروسہ چاہیئے تقدیسِ آرزو کے لئے
میری نگاہ میں اتنا بھرم تو رہنے دو
میں بجھتے بجھتے اُجالوں کے کام آؤں گا
پگھل پگھل کے نئے صبح و شام لاؤں گا

اور دنیائے ادب واقعی بہت روشن ہونے لگی ہے یہ شہر، شہر پھرنا شاعر کے

دل میں منجمد غم کو نہ صرف پگھلا کر کم کرتا ہے بلکہ قارئین و سامعین کے ذوقِ ادب کی رہنمائی کرتے ہوئے ذہن کے اُن گوشوں کو بھی منوّر کرتا ہے جن پہ حالات کے اندھیروں کا دبیز پردہ پڑا ہے۔ "زادِ سفر" سے مسافر کی آبلہ پائی اور صحرائے غم کا مسلسل سفر سمجھ میں آتا ہے بے منزل سفر درپیش ہونے پر خود مسافر تھکے ہوئے لہجے میں کہتا ہے ؎

تھکا ہوا سا مسافر ہوں زندگانی کا
نہ جانے کون سی راہوں میں سانس اکھڑ جائے
اب انتظار بھی کرلوں تو فائدہ کیا ہے
حیات و موت میں ویسے بھی فاصلہ کیا ہے . . .

"یہ جز تمہارے کسے میرے غم کا اندازہ" کسی بے تکلف دوست کے صرف سوال پر نظم لکھنا مشکل نہیں تو آسان بھی نہیں۔ بہت سی رومانی نظمیں قابلِ تعریف اور معیاری ہیں۔ میرے خیال میں اس لئے بھی کہ اظہار کی جرأت بڑی شائستہ ہے۔ "سائباں" ماں کے انتقال کی تفصیل بھی منظوم کی گئی ہے جو دل پہ گہرا تاثر چھوڑتی ہے۔ "اب تک بھی انگلیوں کے اوراق پر نشاں ہیں" ایک شاہکار نظم ہے۔ "پھول گلشن میں کھلیں یا کسی صحرا میں کھلیں" اس نظم میں ہر طرح کے پھولوں کا ذکر ہے۔ احساس کی خوشبو ویرانیٔ دل کے باوجود آس پاس پھیلتی جاتی ہے۔ "ایک سادہ سا ورق" کے خالق نے ماضی کی دہلیز میں ٹھہر کر لکھا ہے ؎

ہر نئے سال کے ہاتھوں سے ہمیں ملتا ہے
ایک سادہ سا ورق . . . . .

روشنی بانٹتے پھرتے تھے سیہ خانوں میں
ہائے کیا بات تھی اُس دور کے دیوانوں میں

"زندگی" "تلاش" جیسی کئی ناقابلِ فراموش نظموں کے علاوہ اپنے عزیز و اقارب دوست، احباب، سیاسی شخصیتوں، شاعروں، ادیبوں، صحافیوں کے علاوہ حیدرآباد دکن سے متعلقہ نظمیں بھی لاجواب ہیں۔ بعض تاریخی واقعات بھی خوبصورتی سے نظم بند کئے گئے ہیں، قلم کی روائتی شان بے نیازی لئے ہوئے ہے، لفظوں اور خیالوں کے خزانے بھرے ہوئے ہیں۔ ثابت ہے کہ شعروادب کے میدان میں اس غازی شاعر نے اپنی بے شمار کامیابیوں کے جھنڈے لہرائے ہیں، اخلاق کا دامن کبھی چاک نہیں ہونے دیا۔ شعروادب سے متعلق کاموں میں اصول ہمیشہ پیش نظر رہے اور اپنے اصولوں میں خلوص بھی شامل رکھا ہے اسی لئے "معتبر شاعر" کہلائے جاتے ہیں، یہ بہت بڑی بات ہے۔

سائنس داں خلاء کی تحقیق بھی مکمل نہ کر سکے، شاعر فکر کے آسمانوں کو تہہ بہ تہہ روندھتا گیا اور وہ انکشافات کرتا گیا جو اس کی فطرت سے ہی نہیں بلکہ تقدیر سے بھی وابستہ ہیں۔ اپنے شعری سفر کے دوران "گل تازہ" "زخموں کے گلاب" "صنم تراش" "شکست در شکست" "رشتوں کی مہک" "خوشبو کا سفر" "یہ کیسا رشتہ ہے" اور "سفر جاری ہے" جیسے سنگ میل اُردو شاعری کی شاہراہوں میں نصب کرتے ہوئے وہ نشتر کی منزل تک پہنچے جہاں "سلسلہ پھولوں کا" ان کی انفرادیت کو اپنے اندر سموئے ہوئے کتابی شکل میں ہم سب کے سامنے ہے۔ یہ جو "سلسلہ پھولوں کا ہے نا!" اس سے کانٹوں کی وابستگی بھی ظاہر ہے۔ بچپن

میں ذہن نشین ہو جانے والے واقعات دوبارہ تحریر میں رونما ہوئے ہیں۔ اپنے ماضی میں دور تک تو پہنچ جاتا ہے لیکن دوسرے کے ماضی میں اتنی دور جانا بس کی بات تو نہیں ہوتی، یہ تو مصنف کا کمال ہے جو اپنی تحریری شان سے قارئین کو اپنے ماضی کی طرف کھینچ لیتا ہے، اہم واقعات وہی ہوتے ہیں جو حافظے میں محفوظ رہتے ہیں، کبھی جی چاہتا ہے کہ زندگی کے ان پُر بہار گوشوں کو صفحاتِ قرطاس پر اس طرح پھیلا دیا جائے کہ "سلسلہ پھولوں کا" ہو جائے۔ کچھ زندگی کے ایسے گوشے بھی ہوتے ہیں جہاں پر سوائے خاردار جھاڑیوں کے ناقابلِ عبور راستوں کے کچھ نہیں ہوتا، مصنّف قارئین کو ان گوشوں میں لے جائیں تو یقیناً قارئین کے دل زخمی ہو جاتے ہیں، احساسِ غم بڑھ جاتا ہے۔ اور پڑھنے کے بعد طبیعت مضمحل ہو جاتی ہے، یوں بھی ہر انسان گردشِ دوراں کی زد میں آتا ہی ہے اور حالات کے زخم لگ ہی جاتے ہیں۔ ایسے میں " سلسلہ پھولوں کا " بڑی راحت دیتا ہے۔

صلاح الدین نیّر صاحب نے کافی احتیاط برتی ہے کہ قارئین کی خدمت میں پھول ہی پیش کیے جائیں، اُن کے کانٹے کسی کو نظر نہ آئیں، پھر بھی پھولوں کے سلسلے میں کانٹے مل ہی جاتے ہیں، لیکن بہت کم .... جیسے کہ خوبصورت بڑے سے گلاب کو جب ہاتھ میں لیا جاتا ہے تب ہمیں ایک چبھن بھی محسوس ہوتی ہے لیکن اُس گلاب کو حاصل کرنے کی خوشی میں ہم خود چبھن کو نظر انداز کر جاتے ہیں! ہے نا!

مجھے اس کتاب میں جو خاص بات نظر آئی وہ ایک گمنام پرستار لڑکی کا

اور صالحہ الطاف کا صلاح الدین نیّر صاحب سے حد درجہ خلوص و تعاون ہے جس کا نیّر صاحب نے کھل کر اعتراف کیا ہے اور برسوں گذرنے کے بعد بھی بھولے نہیں، اس سے اُن کے ظرف کا پتہ چلتا ہے، وہ اپنے کردار کی بلندی پر پہنچ کر بھی اُس تہذیبی زینے کو نہیں بھولے جو اُنہیں اس بلندی پر لے آیا ہے۔ اپنے خاندان کا فرداً فرداً تعارف ان کے خاندان کیلئے ایک تاریخ بن گئی ہے۔ وہ نام جو منتشر تھے اب منجمد ہو گئے، مستند ہو گئے، جو لوگ اس دنیا میں نہیں رہے ان کا نام کتابوں میں رہ گیا، یہ بہت خاص بات ہے کہ کسی کا نام اور تعارف کسی کتاب میں رہ جائے۔ اپنے آباء و اجداد کا حق اس طرح ادا کرنا بہت کم لوگوں کے نصیب میں ہوتا ہے، یہ بہت بڑی سعادت ہے، شجرے نسب کا پتہ تو دیتے ہیں مگر محفوظ کر دیئے جاتے ہیں اور تاریخی کتابوں کا مسلسل مطالعہ ہوتا رہتا ہے۔ صدیوں ان کتابوں کی اہمیت باقی رہتی ہے۔ ہر آنے والی نسل تاریخ کے ان تحریری راستوں پر لمحہ بھر کے لئے رکتی ضرور ہے، جنہیں اللہ توفیق دیتا ہے وہ اپنے خاندان، اپنے شہر کی پہچان دے کر واقعی بڑا احسان کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ ایک طرح سے آنے والی نسلوں کے لئے ترغیب ہوتی ہے نا؟ ....

ملازمتوں، سرکاری معاملوں کا ذکر بھی بہتر طریقے پر کیا گیا ہے، افسروں، ساتھیوں، ماتحتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا جو بہت اچھی بات ہے، ادبی سرگرمیاں اور مختلف انجمنوں کی بنا کی تفصیل بڑی معلوماتی اور دلچسپ ہے، لکھتے وقت دوستوں کی بھی یاد آئی ہے اور کئی طرح کے بہت

سارے دلچسپ واقعات تحریر کئے گئے ہیں۔ نامور شاعروں کے ساتھ گذرے ہوئے دن یقیناً یادگار ہیں ویسے ... موجودہ دور کے شاعروں میں ان کا مقام سب سے الگ اور نمایاں ہے اور ان کی ادبی سرگرمیوں سے دنیائے ادب میں کافی ہلچل ہے کامیاب شاعری، پُراثر ترنم کے بعد نثر کی سادگی اور بے ساختگی میں بھی اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ نیّر صاحب جتنی محنت اُردو ادب کی بقا کے لئے کرتے ہیں وہ بے شک قابلِ قدر ہے۔ انسان جب اپنے آپ پر کچھ لکھنے کی کوشش کرتا ہے تو قدرتی طور پر اپنی کمزوریوں سے بوسیدہ کفن پہلے سامنے آتے ہیں اس کے بعد کردار کے وہ مضبوط خیمے نظر آتے ہیں جو مصنّف کے وجود کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہوتے ہیں دوسروں پر لکھنا میرے خیال میں زیادہ مشکل نہیں کیونکہ دوسرے کے بارے میں آدمی لکھتے وقت ہمیشہ احتیاط کو پیشِ نظر رکھتا ہے لیکن اپنے بارے میں ایسا نہیں کر سکتا۔ کہیں نہ کہیں زندگی کا وہ گوشہ قارئین کی نظر میں آ ہی جاتا ہے جہاں بہت سی ادھوری خواہشیں اور محرومیاں سر جھکائے خود اپنے ماتم میں مصروف ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد قارئین کی تمام ہمدردیاں مصنف کے ساتھ ہوتی ہیں اور اس طرح پرستاروں میں اضافہ ہوتا ہی چلا جاتا ہے۔

بہرحال نیّر صاحب کا "سفر جاری ہے" اس کا ثبوت ہے "سلسلہ پھولوں کا" ——— ہے نا ۔ ۔ ۔ ۔ !

مضمون ختم کرتے کرتے خیال آیا کہ معیاری اور شائستہ اچھوتے انداز لئے ہوئے روحانی تبصروں کا ذکر تو میں نے کیا ہی نہیں، ذکر کرنے کی گنجائش بھی بظاہر نہیں، لیکن کبھی کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے نا کہ سمٹی ہوئی چادر

تان لی جائے تو کشادہ ہو جاتی ہے، اس لئے نیّر صاحب کے کچھ رومانی اشعار لکھنا چاہوں گی، ان کی شاعری میں تغزل نئے انداز سے ظاہر ہے۔ اشعار پیش ہیں

اک عمر سے میں بھی ترے رشتے میں بندھا ہوں - کیا شئے ترے چہرے کی وجاہت میں ملی ہے

بال بکھرائے ہوئے شانوں پہ آجاؤ کبھی ۔ ذوقِ نظارہ وہی قد، وہی قامت مانگے

میں جانتا ہوں کہ آنکھوں میں تیری سب کچھ ہے ۔ مگر گلہ ہے مجھے اپنی کم نگاہی سے

پورا نظر آیا نہ کبھی چاند سا چہرہ ۔ اتنا تو یہاں گیسوئے بر ہم نے کیا ہے

مئے نوشی کا اعزاز مقدر سے ملا ہے ۔ ہم کو تری آنکھوں ہی کے پیمانے بہت ہیں

میں دیکھ لیا کرتا ہوں آنکھوں کو تمہاری ۔ جب لوگ یہ کہتے ہیں کہ میخوار نہیں ہوں

تحفے دئے ہیں اِتنے تمہاری نگاہ نے ۔ ہے دامنِ خیال گلوں سے بھرا ہوا

یہ اور بات ہے کہ تجھے پا نہیں سکے ۔ ہم کائنات تیرے لئے چھانتے تو ہیں

مجھی کو تنگیٔ دامن پہ ہے پشیمانی ۔ بہت سے پھول کھلے ہیں تری نگاہوں میں

دیارِ دل میں آپ آئیں نہ آئیں ۔ چراغِ آرزو جلتا رہے گا

نسیمِ صبح نے جب بھی تمہارا نام لیا ۔ چمن میں کِھل گئے غنچوں کے خوبصورت لب

ہم کسی گھر میں اندھیرا نہیں ہونے دیں گے ۔ ہم کو مل جائیں اگر ایسی منور آنکھیں

انا پسند طبیعت نے نہ صرف پھول کھلائے ہیں بلکہ جس خیالی خاکِ آشیاں کو وقت کی بجلیوں نے جلا ڈالا تھا اور انھی کی خاک کے بارے میں شاعر نے کہا ہے

کب میں نے کہا دل میں چھپانے کیلئے ہے ۔ یہ خاک تو ماتھے پہ لگانے کیلئے ہے

اور اب "حسبِ روایات" شکایتوں کے دفتر، وعدوں کا یقیں، کچھ تردید، کچھ تصدیق جیسے دلی تاثرات لفظوں کے پیراہن میں سج کر قارئین کی ذہنی

مہمان نوازی کے منتظر ہیں ۔

تمہارے دل میں جو پیوست ہے وہی کانٹا ۔ ہمارے دل میں بھی چبھتا ہے کیا کیا جائے
تم مجھ سے جدا ہو کے جہاں بھی رہو تنہا رہو ۔ آنسو کی طرح تم مری آنکھوں میں رہو گے
آپکی دوری سے جب دل کی رگیں کٹ جائیں گی ۔ صبح دم اس شہر میں اک حادثہ ہو جائے گا
اک عمر تلک کچھ مجھے معلوم نہیں تھا ۔ میں کیا ہوں، تمہیں دیکھ کے اندازہ ہوا ہے
قربت رہے گی ترکِ تعلق کے بعد بھی ۔ جاتے ہوئے میں رختِ سفر چھوڑ جاؤں گا
بہت سے لوگ تو اب بھی ہیں ذہن میں محفوظ ۔ تمہاری طرح مگر کوئی دل کے پاس نہیں
میں یاد جو کرتا ہوں تو احساں نہ سمجھنا ۔ یہ تو مرے ہر روز کا معمول رہا ہے
کب تک مرے لہجے کے تاثر سے بچو گے ۔ تم ایک نہ اک دن مری آواز بنو گے
دامن پہ بھیگی پلکوں کی تحریر چھوڑ کر ۔ وہ شخص جاتے جاتے بھی احسان کر گیا
خلوص بانٹتا میں سب کے گھر گیا لیکن ۔ تم آج آئے ہو جب میرا ہاتھ خالی ہے
ہر تنٹ ہلتے نہیں اندیشہ رسوائی سے ۔ مجھ سے بڑھ کر کوئی محتاطِ وفا کیا ہو گا
زندگی کی طرح تم کو بھی بھلا بیٹھا تھا میں ۔ تم ملے تو دل کا ہر اک زخم پھر تازہ ہوا
اسقدر کھل کر نہ ہنستے آپ حالت پہ مری ۔ آپ کو شائد مرے زخموں کا اندازہ نہیں
جب یہ سچ ہے کوئی آہٹ ہے نہ دستک کی صدا ۔ دل کا دروازہ مگر اکثر کھلا رہتا ہے کیوں
محبت میں ذرا سی بدگمانی بھی بہت کچھ ہے ۔ اچانک زندگی بھر کے روابط ٹوٹ جاتے ہیں
تم خود ہی سمجھ لو گے مفہومِ وفا کیا ہے ۔ تم کو بھی محبت میں اندازۂ غم ہو گا
کون اب روک سکے گا بڑھتے ہوئے طوفانوں کو ۔ تجھ کو اندازہ نہیں ہے لبِ ساحل تو ہے
مٹا مٹا کے ترا نام لکھتا رہتا ہوں ۔ یہ ایک کام ہے اب میرے روز کا معمول

نہ دے آواز تو لہجہ بدل کر — تری آواز میں پہچانتا ہوں
خرد کے ہم سفر جب بھی مری دیوانگی ہو گی — میں جس رستے سے گذروں گا تمہاری ہی گلی ہو گی
میرے حالات بڑے شوق سے لکھو لیکن — کوئی لمحہ مرے ماضی کا فراموش نہ ہو
اب زیادہ نہیں دو چار قدم چلنا ہے — مجھ کو مڑ مڑ کے تم اس طرح سے دیکھا نہ کرو

-:-

آخر میں صلاح الدین نیّر صاحب ہی کے اس شعر پر اپنا یہ مضمون ختم کرتی ہوں جو اُن کی اَنا پسند طبیعت کی نہ صرف دلیل پیش کرتا ہے بلکہ اُن کے احساس کی مکمل ترجمانی بھی کرتا ہے سہ

ہم اہلِ درد میں تقسیم ہو نہیں سکتے
ہماری داستاں گلشن میں ڈالی ڈالی ہے

••

انیس قیوم فیاض

نیّر بھائی

صلاح الدین نیّر، حیدرآباد کے ممتاز پُر گو شاعر ہیں۔ مشاعروں کے روحِ رواں ہیں، جن کا نام ہی مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا ہے۔ ان کا اپنا ایک الگ رنگ ہے جو سب کا پسندیدہ ہے، ہندوستان میں بھی اور بیرونِ ملک میں بھی۔ یہاں تک کہ سمندر پار، قطر، کویت، جدہ، ریاض، تک انہوں نے اپنی غزلوں کی مہک بکھیر دی ہے۔ ان کی نظموں کی پاکیزگی اور غزل کی شیرینی نے جہاں سب کو محظوظ کیا ہے وہیں دیرپا و حسین تاثر بھی چھوڑا ہے کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے جب شعر سنگیت میں ڈوب جاتے ہیں اور لفظوں کو موسیقی کی لہریں چھو لیتی ہیں تو غزل کا حُسن سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے۔

رِستے لگے ہیں زخم کہ دل بولتا نہیں
آئینہ اپنا بھید کبھی کھولتا نہیں

مجھ سے نہ تھا اُسے مری غزلوں سے پیار تھا
وہ شخص اجنبی تھا مگر باوقار تھا

صلاح الدین نیّر کے پہلے مجموعۂ کلام "گُلِ تازہ" سے لے کر تازہ مجموعہ "یہ کیسا رشتہ ہے" تک ہر قاری یہ احساس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ نیّر کی سوچوں کا سفر پوری آب و تاب سے جاری ہے جس میں اظہار بھی ہے اور ضبطِ نظم

بھی۔ زندگی ہمیشہ شعلہ و شبنم کا امتزاج رہی ہے۔ نیّر نے زندگی کے ہر اُتار چڑھاؤ پر نظر ڈالی ہے۔ انہوں نے زندگی کو ہمیشہ اپنے مدِمقابل پایا۔ خود ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں ہمیشہ زندگی کی فعال قدروں اور صالح روایتوں کو جگہ دی ہے۔ نیّر کی مقبولیت صرف مشاعروں تک محدود نہیں بلکہ ہندو پاک کے بیشتر رسائل میں ان کا کلام چھپتا رہتا ہے۔ ان کی شاعری خود ان کی شخصیت کی ترجمان ہے۔ انہوں نے ترقی پسندی کی روایت کو اپنے جدید تجربوں سے مزین کر کے ایک نئی انفرادیت پیدا کی ہے۔ ان کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے کوئی بھی شخص ان کی پُرخلوص شخصیت اور ان کے جذبوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مشاعروں کے انعقاد سے لے کر ان کی کارکردگی اور اشاعتِ کتب کے مشکل ترین مرحلوں تک ہر جگہ نیّر بھائی کی کاوش نمایاں نظر آتی ہیں۔ درحقیقت وہ بہترین تنظیمی صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ اُردو مجلس کے ماہانہ اجلاس و دیگر ادبی محفلوں کے وہ روحِ رواں ہیں۔ سکریٹریٹ کے گزیٹیڈ آفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ کثیر الاشاعت اُردو روزنامہ سیاست سے بھی دیرینہ وابستگی ہے۔ ہر صبح سیاست سے شروع ہوتی ہے اور ہر شام سیاست پر ختم ہوتی ہے۔

نیّر بھائی کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ان کی چُستی اور پھرتی ہے ابھی یہاں ہیں تو ۱۵ منٹ بعد آپ انہیں سیاست کے آفس میں دیکھیں گے۔ ان کے مزاج میں بے سکونی کی جو کیفیت ہے وہی شاعری کی ٹکسال ہے۔ ان تمام برسوں میں، میں نے انھیں کبھی آرام سے بیٹھے ہوئے بے کار اور بے مقصد گفتگو کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بچوں کے نام بھی بہت عمدگی اور خصوصیت سے

رکھتے ہیں جیسے انجم کہکشاں اور فروزاں اقبال وغیرہ وغیرہ۔ ان کی بیگم سے بھی میرے پُرخلوص اور دیرینہ مراسم ہیں۔ یہ کوئی دو چار سالوں والی بات نہیں۔ پورے دو دہوں والا سلسلہ ہے۔ ان کا اپنا الگ انداز ہے۔ ان کی اپنی الگ دنیا ہے۔ میرے نزدیک وہ ایک کامیاب صاحب خانہ ہیں جنھوں نے اپنی دنیا کا رنگ و نور کی دنیا سے تصادم ہونے نہیں دیا۔ ہنستی مسکراتی بھابی مجھ سے ہمیشہ یوں ملیں جیسے وہ میری بڑی بہن ہوں۔ الغرض! نیرؔ بھائی ایک بہترین شاعر، بہت ہی اچھے بھائی اور بہترین استاد ہیں۔ ان کی شفقت نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی ہے۔ آج بھی ہر چھوٹے بڑے معاملے میں میں اور اقبال، نیرؔ بھائی کے مشوروں کو مقدم سمجھتے ہیں۔ یہ کون نہیں جانتا کہ شہر در شہر وطن در وطن اپنی غزلوں کی سوغات لٹانے والے شاعر کا دل اپنے وطنِ عزیز سے کس قدر دیوانہ ہے۔ شائد اسی مناسبت سے انہوں نے ایک جگہ کہا ہے۔

یارب! دیارِ غیر میں آوارہ گر پھروں
مٹی میرے وطن کی میرے ہاتھ میں رہے

صُغریٰ عالم

صلاح الدین نیّر اور خوشبو کا سفر

صلاح الدین نیّر کا پانچواں مجموعہ 'خوشبو کا سفر' اُس ایک خوشبو کا نام ہے جو تخلیقی عمل کا محرک ہے۔ جس کی تخلیقی لہریں اس طرح گردش کرتی ہیں کہ شاعر کے جگر میں پیوست ہو جاتی ہیں اور اپنا نورانی عکس دکھاتی ہیں۔ جو جلتے بجھتے چراغوں کا سماں باندھ دیتی ہیں۔ شعر کی نمو اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک نور و رنگ، حسن و خوشبو کے محرکات اپنا نقش اُجاگر نہ کریں یا سوزِ احساس سے شاعر کے تخیل میں تخلیق کی جلوہ نمائی نہ کرا لیں۔

'خوشبو کا سفر' ایک شعری سفر ہی نہیں، نیّر کی شخصیت کا آئینہ دار بھی ہے۔ اُن کے وقار اور وضع داری کی تفسیر ہے۔ سنگلاخ زمینوں پر چلتے چلتے چاندنی اور خوشبو کا احساس کرنا ایک شعورِ تابندہ کا ثبوت ہے۔ اس قسم کی شاعری سے خیال اور زبان کی نسبتِ دیرینہ کے پیمانے قائم کئے جاتے ہیں۔ حُسنِ تخیل ہو تو الفاظ کو دل فریبی حاصل ہوتی ہے۔ لامحدود تخیل کو ایسے مختصر سانچوں میں ڈھالا جاتا ہے کہ سارا گلستاں بس ایک خوشبو ہو کر رہ جائے۔ باکمال شاعر ہی تخیل کی لامحدودیت کو اپنے ایسے الفاظ میں سمو دیتا ہے کہ شعر کو بے انتہا کر دے جیسے نیّر

نے کہا ہے ؎

نہ جانے کس کو یہاں کون چھین لے جائے ۔ اِسی لئے تو تیرے آس پاس رہنا ہے
جو دل میں بستا ہے وہ کتنی دور رہتا ہے ۔ تمام عمر چلا اُس کا گھر نہیں آیا
اور نیتر جیسے حساس شاعر انسان کے لئے رشتوں میں لطافت اور رشتوں کا بانکپن ہے۔
رشتے جو شیشے ہوتے ہیں ان کو شعروں میں ڈھالنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ
رشتوں کو نباہ لینا۔ الفاظ کی سنگینی سے ٹھیس بھی لگ سکتی ہے۔ خوشبوؤں سے
معطر رشتے اور مہکتی زبان نیتر کی شاعری کی تفسیر ہیں۔

رشتوں کی بندشیں، احساس کی گرفت، خلوص کی حصار بندیاں تمام کی تمام
ایک حساس انسان کا ورثہ ہیں جس کو وہ ہر لمحہ اپنے سینے سے لگائے سرگرم سفر ہوا
کرتا ہے۔ کن رشتوں کی پناہوں نے جلا بخشی، کن رشتوں کی کسک نے انہیں شاعر
بنا دیا۔ خود نیتر کے شعر بہ نفسِ نفیس اعلان کرتے ہیں۔

تہذیبِ حسن و عشق سے ہے رشتوں کا سلسلہ ۔ تم کو نہ چاہوں ایسا گنہگار تو نہیں
ہمارے بیچ جو خوشبو کا ایک رشتہ ہے ۔ اُس ایک رشتے کو نیتر تیرا نبھائے گا
تازہ رہے ہمیشہ محبت کا احترام ۔ کچھ اس طرح سے رشتوں کو نیتر نبھائیے گا
توفیق نہ ہو جب تک رشتوں کو سمجھنے کی بھیگی ہوئی پلکوں کو مصروفِ دعا رکھنا
کچھ ایسے رشتے بھی ہوتے ہیں جو نظر نہیں آتے صرف محسوس کئے جا سکتے
ہیں اور شاید صرف نیتر جیسا حساس انسان ہی محسوس کر سکے جیسے

غالباً یہ بھی ہے اک ترسیل کا ہی معجزہ
میری پلکیں تک نہ بھیگیں تیرا دامن تر ہوا

کس قدر والہانہ اندازِ بیان ہے۔ کلام کی روانی اور برجستگی کے کیا کہنے۔ احساس پر ایسی گرفت کم لگتی ہے کہ یہ وہ بات ہے جو کہیں کہی تھی اور نیّر نے کہہ دی ایک اچھا شعر ایک شاعر کی ہستی کا بہترین شاہکار ہوسکتا ہے جس میں وہ اپنی روح پھونک دیتا ہے۔

ایک رشتہ بدن کا روح سے' ایک رشتہ انسان کا انسان سے' ایک رشتہ انسان کا اپنے گھر سے' دوست احباب سے اور خود اپنے شہر سے بھی ہوا کرتا ہے۔ نیّر نے نہ صرف خوشبو کی نزاکتوں کو اپنایا ہے بلکہ تارکی چبھن کا المیہ بھی بیان کیا ہے۔ نیّر کے اس شہر کی داستانِ شب و روز جس کی بہاریں دم توڑتی ہوئی ہیں اور خزاں ثبات آشنا ہوتی جارہی ہے جہاں شعور کی شمع بجھتی جارہی ہے اور افراتفری و شرپسندی کے اندھیرے بڑھتے جارہے ہیں۔ سارے شہر میں مردم گزیدہ کی آبادی بڑھتی جارہی ہے۔ ان اشعار کی تہہ میں شہر حیدرآباد ہی ہے۔

آج تک پردہ پڑا ہے کون پس منظر میں تھا ۔ شہر جب جلنے لگا تھا میں بھی اپنے گھر میں تھا
کب تلک یہ سنگباری آئینوں کے شہر میں ۔ ہم نمونہ تھے کبھی تہذیبِ عالم کے لئے
پھولوں سے گفتگو کا زمانہ گذر گیا ۔ خنجر زنی کا راج ہے شہرِ نجات میں
سب قاتلوں کا چہرہ یہاں ایک جیسا ہے ۔ کس کس کا نام لکھو گے اس واردات میں

نیّر کی شاعری میں وہ تفسیرِ شہر شرحِ واردات ہے جس سے حیدرآباد کی تاریخ کا ایک باب ہم پر کھلتا ہے تو سارے حالات عیاں ہو جاتے ہیں۔ نیّر کی دھڑکنوں میں حیدرآباد کی تہذیب ملتی ہے۔ بربریت نے جب ساری آبادی کو تہہ و بالا کیا تو نیّر نے کہا۔

صبحِ آزادی اُجالوں کی ضمانت تھی مگر
اِس ادا سے روشنی آئی کہ بینائی گئی

نوکِ خار پر بھی زبان کی آرائش و زیبائش ایسی کہ اُجالوں کی ضمانت دیتی ہو۔ اقلیت کا مقدر کیا ہے۔ شہر کی پارسائی میں کہاں تک ہماری تطہیر نے کام کیا اور جب فضا مکدر ہونے لگی تو ہم کس طرح لُٹتے رہے۔ وہ حالات جس کو نیر نے قریب سے دیکھا" وہ الاؤ جو نیر کے اطراف سلگتا رہا، نہ جانے کون کب زیرِ آستیں، خنجر چھپائے مل جائے۔

جب تک ہم نہ لُٹے ہم کو یہ اندازہ نہ تھا
قاتلِ شہر کی کس کس سے شناسائی ہے

جلتی شاہراہوں پہ دشت نما شہر اور شہر میں ظلم و جبر کے شعلوں کو دیکھا دھویں کو محسوس کیا۔ مشاہدہ میں آنے والی نوکِ خنجر" اُچھلتے ہوئے خون کی سُرخی، بلکتی ہوئی لاشیں ایک سناٹا۔ مہیب سناٹے جس پہ ٹھہرا ہوا وہ مہیب لمحہ جو صدیوں پہ گراں ہو" جلتے دنوں اور محبوس راتوں کو شعری پیکر دینا نیر جیسے باکمال شاعر کا ہی حد ہے۔ حُسن، چشمِ بینا ہی میں ہے۔ نظر خود حسین ہوتی ہے اور اپنا معیار آپ قائم کر لیتی ہے۔ نیر کی چشم بینا دوسرے شعرا کے درمیان اپنا امتیازی مقام رکھتی ہے جن میں حُسن کی معنویت جلوہ گر ہے۔

توصیفِ خد و خال کا آساں تھا مرحلہ ۔ لیکن تمہاری آنکھوں کی تفسیر رہ گئی
وہ جس نے ہمیں دی تھی اُجالوں کی بشارت ۔ وہ چہرہ دکھایا ہی نہیں دیدہ وری نے

(تبصرہ "سالار" بنگلور) ۱۹۸۴ء

ڈاکٹر فہمیدہ ممتاز

گلِ تازہ

"گلِ تازہ" کے حسنِ باطنی و ظاہری کو دیکھ کر جو مسرت ہوئی، شاید آپ اس کا اندازہ نہ کر سکیں۔ میں نے 'گلِ تازہ' کا پہلے سے جو تصور باندھا تھا، دراصل وہ اس سے کہیں زیادہ حسین نکلا۔ عذرا سعید کے قلم میں جادو ہے۔ دولہن نہ چلے والی تصویر مع شعر کے شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ تصویر اور شعر کی مطابقت عجیب فرحت بخش احساس بخشتی ہے اور سرورق میں بھی یہی بات محسوس ہوتی ہے۔ میرے خیال میں حُسن کہیں بھی ہو کسی بھی روپ میں ہو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اُس کے بیان کرنے میں کئی کوتاہیاں رہ جاتی ہیں۔

"سرگذشتِ دل" کے فوراً بعد ساز والی تصویر اور شعر، دوبارہ سرگذشتِ دل نئے انداز سے کہہ رہی ہے۔ اس کے ساتھ میرے ذہن کے پردے پر ایک اور تصویر بھی اُبھر آئی۔ آپ کی سرگذشتِ دل تو چار پانچ صفحوں پر ہی نہیں پورے ایک سو بارہ صفحات پر رچی بسی ہوئی ہے۔ میں کبھی اپنے آپ سے یہ سوال کرتی ہوں کہ انسان کی زندگی میں جذبات کو اہمیت نہ ملتی تو کیا ہوتا، ان کی حکمرانی نہ ہوتی تو کون حکمران ہوتا۔ کبھی کبھی انسان مجھے صرف ان جذبات و احساسات کی وجہ سے

اتنا خوبصورت اور پیارا لگتا ہے کہ سکون ہی سکون مل جاتا ہے۔ اور یہیں پیاسی روح کو بالیدگی اور ذہن کو تسکین مل جاتی ہے۔ زندگی کے کتنے ہی پوشیدہ اسرار کھلی کتاب کی طرح سامنے آجاتے ہیں۔ ہر زخم سہنے اور ہر چوٹ برداشت کر لینے کی ہمت تو پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ کے ہاں سوز و گداز بھی ہے اور قہقہوں کی گونج بھی ہے۔ آپ نے یہ ٹھیک ہی لکھا ہے کہ آنسوؤں میں مسکراہٹ ہے۔ انسان اُسی وقت اشرف و عظیم کہلا سکتا ہے جبکہ آنسو اور مسکراہٹ دونوں پر برابر قابو پائے۔ آنسوؤں کے درمیان مسکرائیے، مسکرا کر آنسو بہائیے مگر یہ فن جلد ملنے والا نہیں۔ زندگی کے کتنے ہی لمحات زندگی کی بھٹی میں تپائے جائیں تب کہیں یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

(۱۹۶۶ء)

محمودہ شبنم (میسور)

گلِ تازہ

"گلِ تازہ" صوری و معنوی لحاظ سے اتنا پسند آیا کہ صحیح تاثر بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ اندر صفحات پر جو تصاویر یا آرٹ کے نمونے ہیں بے انتہا حسین مرقع ہیں۔ فنی لحاظ سے بھی اِن مرقعوں کا جواب نہیں۔ اِن مرقعوں کی بھی داد دیئے بغیر نہ رہ سکوں گی۔ دوسری چیز جو مجھے بے حد پسند آئی وہ آپ کا اپنا تعارف، نثر میں ہے۔ جو شعریت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اشعار جو مجھے بے حد پسند آئے وہ لکھ دیتی ہوں۔

تنہائی کے عالم میں مرے پاس رہی ہے وہ یاد جو احساس کے سانچوں میں ڈھلی ہے

بہت ہی دور سہی منزلِ وفا لیکن خلوصِ عشق سلامت، ہزار رستے ہیں

زندگی میری بظاہر اک شکستہ ساز ہے سُننے والوں کے لئے آواز ہی آواز ہے

زمانے بھر کے جو الزام ہوں وہ سب کہئے مگر خدا کے لئے کچھ نہ بے سبب کہئے

کل تمام دن "گلِ تازہ" پڑھتی رہی۔ آج کالج ساتھ لے گئی تو کسی سہیلی نے اُچک لیا، اب نہ جانے کتنے ہاتھوں سے ہوتا ہوا مجھ تک پہونچے گا۔ تمام غزلیات پڑھنے کے بعد آپ کی شخصیت بالکل سامنے آجاتی ہے۔ بس ایک بہت سا پردہ حائل ہے۔

ہے کائناتِ محبت کو اک حسیں انعام
ترے سخن کے چمن میں رہے بہار مدام

(شبنم)

(۱۹۶۶ء)

مظفر النساء ناز

میرے اچھے بھائی جان

(صلاح الدین نیر)

مجھے آپ کا "خوشبو کا سفر" بڑا سہانا لگا۔ دل چاہتا ہے کہ آپ کا یہ سفر ہمیشہ جاری رہے۔ میں نے کتاب کھولی تو میری نظر "اُس خوشبو کے نام" کے ساتھ ہی گلِ تازہ کی یاد تازہ ہو گئی۔ آپ نے کس خوبصورتی سے "گلِ تازہ" کو یاد کیا جائے

وہ سیدھا سادا سبھی طرحدار کتنا تھا ۔ ہزاروں چہروں میں بھی باوقار کتنا تھا
خدا رکھے نہ کسی کو اسیرِ تنہائی ۔ وہ روبرو تھا مگر بے قرار کتنا تھا
اِتنا ہے بس اَب یاد کہ دو ہاتھ ملے تھے ۔ کیا میں نے لیا تھا، مجھے کیا تم نے دیا تھا
کہاں تلک میں یونہی بوند بوند کو ترسوں ۔ تم ابر تھے تو تمہیں ٹوٹ کر برستا تھا
اے بدنصیبی تجھ سے یہ کیا بھول ہو گئی ۔ آنگن میں کس کے جانا تھا تو کس کے گھر گئی
کل شب تمہارا روٹھ کے جانا نیا نہ تھا ۔ تم کو منا کے لانا ہمارا نیا نہ تھا
گلاب جیسا بدن اور یہ سیاہ لباس ۔ میری نگاہوں کی بڑھنے لگی ہے اور بھی پیاس
تمہیں پتہ نہیں کاجل لگی ان آنکھوں میں ۔ ٹھہر گئی ہے میری آ کے عمر بھر کی پیاس

پھر آنے والے کل میں کھو گئے، اور کہتے ہیں ؎

اب کے برس جب آئیں تو اسطرح آئیے۔ میری زمین پہ اپنا بھی اک گھر بسائیے
خوشبو، حنائی ہاتھوں کی پھر یاد آ گئی۔ کچھ اور خوشبو اب کے برس ساتھ لائیے

یوں تو آپ کا ہر شعر تعریف کے قابل ہے۔ کہیں کہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ نہیں موتی ہیں۔ بعض دفعہ مجھے رشک ہوتا ہے، پھر سوچتی ہوں، ہے تو میرا بھائی جو جان سے زیادہ عزیز ہے۔ میں صدقِ دل سے دعا کرتی ہوں۔ وہ ہمیشہ خوشبو کے سفر میں گُلِ تازہ کو ساتھ لئے رہے اور شعری مجموعے شائع کرتا رہے۔ آپ کے قلم میں واقعی کمال ہے۔ آپ سیدھے سادے شعر میں بھی ایک گہری بات کہہ جاتے ہیں۔

نظم کے یہ مصرعے بھی خوب ہیں ؎

یہ لڑکی جس کسی چوکھٹ پہ جا کے ٹھہرے گی
تمام برکتیں میکے کی ساتھ لائے گی
یہ لڑکی جس کسی آنگن میں پاؤں رکھے گی
وہاں کی مٹی سے اک تازہ خوشبو آئے گی

-۲۰-

یہ پیار کی خوشبو بھی عجیب چیز ہے نیر۔ جس شہر میں ہو تم مری آنکھوں میں رہو گے
ایک دن کاندھے پہ تیرے ہو گا اک مانوس سر۔ اپنی تنہائی سے نیر اِتنا گھبرانا نہیں
اچھا ایک اور بہن عیدی کے لئے آ گئی۔ مبارک! (۱۹۸۴ء) --

قمر جمالی

صلاح الدین نیّر۔ قمر جمالی کی نظر میں
(یہ کیسا رشتہ ہے)

میں صلاح الدین نیّر کو شہر و قبیلہ کا شاعر سمجھتی ہوں۔ صلاح الدین نیّر نے اپنی ۲۵ سالہ ادبی زندگی میں بہ حیثیت شاعر خود کو شہر و قبیلہ کا نقیب ثابت کیا ہے۔ صلاح الدین نیّر ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان بھی ہیں۔ نیّر نے شاعری کو تفریح طبع کے لئے استعمال نہیں کیا بلکہ اپنے لئے زندہ رہنے کا بہانہ بنالیا ہے۔ صلاح الدین نیّر نے اپنی طبعی زندگی کے ۲۵ سال اس تجرباتی سفر میں گذارے ہیں۔

نیّر صاحب بظاہر لئے دیئے رہنے والے شخص ضرور دکھائی دیتے ہیں مگر جو ذرا ان کے دل میں نہاں اس جذبۂ اپنائیت کو کسی سوئی کی انی سے چھو کر دیکھیں۔ خلوص کے چشمے انسانیت و تقدس کی گلی کوچوں سے گذر کر ان کی چھوٹی مگر چمکدار آنکھوں کے پیچھے کھنچی ٹیڑھی ترچھی نہروں میں جم جاتے ہیں۔ نیّر صاحب کے مزاج کا خاصہ تو یہ ہے کہ وہ کبھی کسی سے مل کر بھولتے نہیں ہیں

اور شاید یہی اُن کی پہچان بھی ہے اور ہر دل عزیزی کی ضمانت بھی۔

قبول صورت، سانولی رنگت، اونچا قد (زیادہ اونچا نہیں)، چھریرہ بدن، بالوں کی مخصوص شاعرانہ انداز میں سجاوٹ اور صرف اور صرف ہندوستانی لباس میں شیروانی پاجامہ میں نظر آنے والے۔ صبح سے شام تک دفتر سیاست کے ایک گوشے میں ہاتھوں میں کاغذ کا پلندہ اور پن لئے۔ اُس وقت بھی جب وہ سکریٹریٹ میں اچھے سے عہدہ پر فائز تھے، اِن ہی حالات کا شکار تھے۔ دفتریت کم اور ادبی خدمت زیادہ۔ دراصل نیر صاحب اُن لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اُردو کے ساتھ عاشقانہ رویہ روا رکھا ہے۔

نیّر صاحب نے اپنے داخلی جذبات پر اخلاقی حدبندیوں کی گرفت کو مضبوط رکھا۔ ویسے یہ بات بھی درست ہے کہ ان کے داخلی جذبات میں اتنی بے ساختگی ہے کہ وہ کسی بھی خارجی گرفت میں آتے نظر نہیں آتے۔ ان کی کتاب "یہ کیسا رشتہ ہے" میرے اس احساس کی نقیب ہے کہ اس ساری کتاب میں شاعر ایک کربناک تجربے سے گذرتا ہے اور کسی نہ کسی بہانے اُس کرب کو ایک نام دینے کی کوشش کی ہے۔ کبھی ماں، کبھی بہن اور کبھی دوست حقیقت تو یہ ہے کہ نیّر نے اس کتاب میں جس رشتہ کا ذکر کیا ہے وہ بس ایک درد کا رشتہ ہے کیونکہ درد محض درد ہوتا ہے جو ٹھیس لگنے سے بھی محسوس ہوتا ہے اور ٹیس اُٹھنے سے بھی۔ میں یہ بات اطمینان سے کہہ سکتی ہوں کہ نیّر نے اس ساری کتاب میں محرومی کے ایک کرب کو سہتے سہتے ہوئے کسی نہ کسی آنچل میں منہ چھپانے کی کوشش کی ہے۔ کبھی ماں کے آنچل

کی ابر رحمت میں تو کبھی بہن کے مقدس دوپٹے کی چھاؤں میں۔ نیر صاحب کلاسیکی خد و خال میں عصری مزاج کے شاعر ہیں، اس لئے ان کی شاعری کو اگر شراب مان لیں تو وہ دوآتشہ ضرور ہے۔

نیّر صاحب کا شعری سفر "گلِ تازہ" سے شروع ہو کر "یہ کیسا رشتہ ہے" تک پہنچ چکا ہے جس کے لئے انہوں نے اپنی عمر عزیز کے ۲۵ سال صرف کئے ہیں۔ ان ۲۵ برسوں میں نیّر ایک مسلسل کرب کے عالم میں جیتے رہے۔ غزلوں کی فنّی خصوصیات پر کچھ کہنے کی میں خود کو اہل نہیں سمجھتی ہوں۔ یہ ضرور کہوں گی کہ غزل ہو یا نظم ایک آہ ایک کرب سارے کلام میں زیرِ لہر دوڑتا رہا۔ 'یہ کیسا رشتہ ہے' میں عشق کی مہک اور جوانی کا بانکپن ہے۔ وارداتِ قلبی کا بے ساختہ اظہار ہوا ہے۔ اس بے ساختگی اور بانکپن کا کوئی جواب نہیں۔ 'یہ کیسا رشتہ ہے' پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کا ہر صفحہ ان کی ابتدائے عشق کی کئی کہانیاں سناتا ہے۔ 'یہ کیسا رشتہ ہے' میں نیّر جس "تم" سے مخاطب ہیں، نہیں لگتا کہ وہ ایک تخیلی پیکر یا خیالی محبوبہ ہے کیونکہ اس کتاب کے ہر صفحہ اور ہر نظم سے نیّر کی شاہزادی تم، مادی پیکر کے ساتھ باہر آجاتی ہے اور قاری کو اس طرح مسمرائز کرتی ہے کہ میں تو کیا ایک عام قاری بھی یہ کہنے لگتا ہے کہ نیّر کی محبوبہ کوئی خیالی پیکر نہیں جسے نیّر نے کاغذی پیرہن میں دفن کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ وہ ایک زندہ اور مادی جسم ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہاں یہ بات بھی اُبھر کر سامنے آئی ہے کہ نیّر اقدار کا مارا ایک مہذب انسان ہے۔ تہذیب کی کھینچی لکیروں نے شاعر کو اپنے محبوب سے پرے ڈھکیل

دیا ہے مگر شاعر نے اپنے اور اپنے محبوب کے بیچ پیدا شدہ خلا کو پُر کرنے کے لئے ایک پُل تعمیر کر لیا ہے۔ اُس پل کا نام ہے 'یہ کیسا رشتہ ہے'۔

نیّر نے 'یہ کیسا رشتہ ہے' لکھ کر یہ سمجھ لیا کہ اُنھوں نے اپنے جذبات پر پردہ ڈال کر وفا کی لاج رکھ لی۔ مگر نہیں، یہ اُن کی خام خیالی ہے کیونکہ 'یہ کیسا رشتہ ہے' براہ راست ان کی محبوبہ کی نشان دہی کرتی ہے۔ میں تو یہاں تک کہہ سکتی ہوں کہ نیّر صاحب کی یہ محبوبہ ہے "گلِ تازہ"۔ جذبات کی صداقت اور اظہار کی بے ساختگی کا یہ عالم ہے کہ نظم در نظم سلسلۂ عشق خود بخود بے نقاب ہو جاتا ہے اور ایک داستانِ عشق آپ ہی آپ تخلیق ہو جاتی ہے اور قاری شاعر کے داخلی جذبات سے بے نیاز رہ ہی نہیں سکتا۔ نیّر صاحب کے اس مجموعے "یہ کیسا رشتہ ہے" میں زبان کی گھلاوٹ اور جذبات کی نرمی و گرمی نے اُسے تاثر کے معراج کو پہونچا دیا ہے۔ اس کے لئے نیّر صاحب قابلِ مبارکباد ہیں کیونکہ تاثر ہی فن پارہ کی کامیابی کا ضامن ہے۔

--

○

اقبال جہاں قدیر

ایم اے، ایل ایل بی (عثمانیہ)

صلاح الدین نیّر۔ شخصیت اور فن

صلاح الدین نیّر صاحب اُردو زبان و ادب کے بڑے شیدائی ہیں۔ اُردو کی بقاء، اس کے تحفظ اور اسکی ترویج کے لئے ہمہ تن مصروف رہا کرتے ہیں۔ اس محنتی اور مخلص انسان نے اپنی قابلیت اور مسلسل انتھک کوششوں سے اُردو شعر و ادب میں اپنا ایک نمایاں مقام بنالیا ہے۔ نیّر صاحب نہ صرف حیدرآباد، اضلاع بلکہ کُل ہند مشاعروں اور بیرون ملک کے مشاعروں میں بھی اپنا کلام سناکر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں، وہ ایک انٹرنیشنل شاعر بن چکے ہیں۔ وہ ایک اچھے ادیب بھی ہیں نیّر صاحب گوناگوں مصروفیات کے باوجود علمی، ادبی اور تہذیبی کاموں میں جی بھر کر حصہ لیتے رہتے ہیں۔ شہر کی انجمنوں اور ادبی اداروں سے اپنی وابستگی کی بناء پر بھی وہ کافی مقبول ہو چکے ہیں۔

صلاح الدین نیّر صاحب کو شعر و ادب کا ذوق ورثہ میں نہیں ملا بلکہ یہ تو ان کی خداداد صلاحیتوں کی دین ہے۔ بچپن میں وہ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ شریر بھی تھے۔ ہمنا باد میں جماعت ہفتم تک تعلیم پائی۔ بعد میں منشی کا امتحان بھی

کامیاب کیا۔ مزید تعلیم کے حصول کی خاطر نیّر صاحب حیدرآباد آ گئے اور یہیں کے ہو رہے۔ اُردو عالم، اُردو فاضل، ادیب کامل کے امتحانات اعلیٰ نمبرات سے کامیاب کئے، علی گڈھ یونیورسٹی سے میٹرک کیا، مدھیہ پردیش سے انٹرمیڈیٹ، پھر عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ او۔ ایل اور ایم او ایل اچھی پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔ ان کی عمر صرف سولہ سترہ برس کی ہوگی کہ ان کی شادی ہوگئی۔ ان کی شریکِ حیات دین دار، نیک دل اور سلیقہ مند خاتون ہیں۔ نیّر صاحب، صاحبِ اولاد ہیں۔ خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں

جہاں تک ان کی ملازمت کا تعلق ہے، نیّر صاحب پہلے پہل محکمہ سیول سپلائز میں بحیثیت کلرک ملازم ہو گئے تھے۔ پھر ڈائرکٹر آف کمیونٹی پراجکٹ میں کام کرنے لگے ۱۹۵۶ء میں سکریٹریٹ سے وابستہ ہو گئے۔ سکریٹریٹ میں انہوں نے اُردو اسوسی ایشن قائم کیا۔ تمام اُردو جاننے والے عہدہ داروں سے ان کے مراسم بڑھتے گئے۔ سکشن آفیسری کے زمانے میں وہ اور بھی متحرک ہو گئے۔ ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں جہاں پر لوگ اپنے آپ کو حکومت کی انتظامیہ میں مصروف رکھتے ہوئے بھی علم و ادب کے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔ نیّر صاحب کی ادبی زندگی قابلِ رشک ہے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ بی او ایل اور ایم او ایل کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر لیں۔

نیّر صاحب کی شاعری کے اب تک مجموعے گلِ تازہ، زخموں کے گلاب، صنم تراش، شکن در شکن، خوشبو کا سفر، رشتوں کی مہک، سفر جاری ہے، اور یہ کیسا رشتہ ہے شائع ہو چکے ہیں۔ نثر میں "عظمت عبد القیوم فن اور شخصیت" اور "عظمتِ خیاباں (عظمت عبد القیوم) کے مولف ہیں۔ انہوں نے اپنی خود نوشت

سوانح "سلسلہ پھولوں کا" ۱۹۹۱ء میں شائع کی۔

معیاری شاعری میں جذبہ و فکر بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اور یہ بات بھی ہے کہ بعض شاعروں کے یہاں صرف جذبہ کی فراوانی ہوتی ہے اور بعض کے یہاں فکر کی گہرائی و گیرائی ملتی ہے۔ یہ دونوں عناصر ہمیں نیّر صاحب کی شاعری میں مل جاتے ہیں۔ نیّر صاحب کا کلام ان کی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ پاکیزہ خیالات اور اچھی صلاحیتوں کے حامل یہ عوامی شاعر دن بھر لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں۔

صلاح الدین نیّر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کے مجموعوں میں قدیم اور جدید دونوں طرز کا کلام ملتا ہے۔ نیّر صاحب عشق کو زندگی سے الگ نہیں سمجھتے ان کی غزلوں میں روزمرہ زندگی کے ایسے تجربات بھی ملتے ہیں جن میں گرمیٔ حیات بھی ہے احساس کی چبھن بھی، مذاقِ عشق کو شعری پیکر میں خوبصورتی سے ڈھال لینے کا فن انھیں بخوبی آتا ہے۔

حسن کی کب تک پردہ داری، عشق ہی اپنا رسوا کیوں\
تم کو جس نے دل سے چاہا اس سے رشتہ ٹوٹا کیوں\
پروانہ تو پروانہ ہے، جانے کیا انجامِ وفا\
شمع کی لو پر جلنے والا اپنی آگ میں جلتا کیوں

صلاح الدین نیّر صاحب نے بہت اچھی اچھی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ نیّر صاحب نے کچھ نعتیں بھی کہی ہیں۔ ان کی نعتیہ شاعری ان کے عشقِ رسولؐ کی آئینہ دار ہے۔ ویسے تو نیّر صاحب غزلیں ترنم سے

پڑھتے ہیں۔ لیکن جب وہ اچھے ترنم اور عشقِ رسولؐ میں ڈوب کر اپنی نعت پڑھتے ہیں تو سننے والے محبانِ رسولؐ کی آتشِ شوق کو اور بھی بھڑکا دیتے ہیں اور محفل پر ایک عجیب سی نورانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ شاعر اور سامعین دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ صلاح الدین نیر صاحب روضۂ اقدسؐ پر حاضری دے کر آئے ہیں۔ پھر بھی حسرت ہے کہ مدینہ جائیں ؎

آنکھوں میں لئے حسرتِ دیدارِ محمدؐ
میں کب سے مدینہ کی طرف دیکھ رہا ہوں

نیرؔ صاحب کا پھولوں سے رشتہ ہے۔ زخموں سے الفت ہے، محبت ہے۔ یہ کُل کیا ہے جب میں نے آج صبح اپنی آنکھوں کو ان اوراق پر بچھایا تو پہلے یہ شعر پایا ؎

پیار خوشبو کا سفر ہے، چل رہا ہوں صبح و شام　　اک نہ اک دن راہ میں نیرؔ بھی گھر آجائے گا

نیرؔ ایک یاتری ہیں، مسافر ہیں۔ حیدرآباد کے کلاسیکی غزل گو شاعروں میں نیرؔ صاحب کا جو مایۂ ناز مقام ہے مجھے اس سے واقفیت ہے۔ کلاسیکی شاعر کے ناطے وہ صرف ماضی کے پرستار نہیں وہ مستقبل کے راہی ہیں۔ پھول کیا ہے؟ پھول کا کھلنا ایک آغاز ہے۔ جب میں پڑھ رہا تھا یہ جذبات اختصار کے ساتھ میں میرے دل میں اُتر رہے تھے۔ اُن کے ہاں ایک کلاسیکل شاعر ہونے کے ناطے مستقبل کا ویژن ہے۔ خوشبو کا سفر، کوئی معمولی عنوان نہیں ہے۔ پھول کھلنا آج کی بات ہے، خوشبو کا پھیلنا مستقبل کی بات ہے۔ نیرؔ کل کے، آج کے شاعر نہیں، مستقبل کے شاعر ہیں۔ کلاسیکی غزل گو شاعر ہوتے ہوئے بھی ان کے خیالات و جذبات اس طرح کے ہیں۔ ؎

بہتے ہوئے دریا میں کنول چھوڑ رہا ہوں　　کچھ دن کے لئے شہرِ غزل چھوڑ رہا ہوں

یہ خیال بہت جدید ہے۔ نیاپن ہے۔ ایک شاعر ہونے کے ناطے مجھ میں بھی ایک ہلچل پیدا ہوگئی ہے۔ "شہرِ غزل" —— نیرؔ صاحب قابلِ مبارکباد اس لئے بھی ہیں کہ اُن کے ہاں فرقت، آنسو، آہیں بھرنا، شمع، پروانہ اور گذری ہوئی باتوں کا ماتم نہیں ہے، وہ ماضی کی باتوں کو بنیاد بناکر نئے مینار تعمیر کرتے ہیں۔ نیرؔ کہتے ہیں۔ شہرِ غزل، چھوڑ رہا ہوں لیکن وہ غزل کہہ رہے ہیں۔ اِس میں جذبات کی شدت ہے۔ چڑچڑاپن ہے۔ غصہ بھی ہے۔

حصے میں مرے آئی ہے جمنا کی اُداسی - تیرے لئے میں تاج محل چھوڑ رہا ہوں

یہاں پر ہیں نے جدت پسند ، ترقی پسند نیّر کو پایا۔ اِس میں مستقبل کا اشارہ ہے

دم گھٹنے لگا بند فضا میں مرا نیّر - کٹیا کے لئے راج محل چھوڑ رہا ہوں

کیا نیا پن ہے۔ ایک ترقی پسند شاعر ہی ایسی بات کہہ سکتا ہے۔ غزل گو شاعر ہوتے ہوئے بھی نیّر نے یہ بھی کہا ہے ؎

گلاب جیسا بدن اور یہ سیاہ لباس
مری نگاہوں کی بڑھنے لگی ہے اور بھی پیاس

اِس شعر میں سماجی شعور کے بارے میں اشارہ ہے۔ خواتین کی طرف اشارہ نہیں۔ اِس طرح ایک غزل گو شاعر میں ، سماجی شعور کا عکس ہم اس کے درپن میں پاتے ہیں۔

پدم سری ڈاکٹر سی۔ نارائن ریڈی
چیرمن آفیشیل لنگویج کمیشن
حکومت آندھرا پردیش

○

● نیّر صاحب کی ادبی اولاد ہونہار ہے بلکہ بہت کام کی بھی ہے۔ نیّر کی شاعری ، اُن کے خیالات اُن کا میٹھا ترنم ، ان کی کتابوں کی نکاسی میں معاون رہی ہیں۔ اُن کی ذات میں ایک خاص گُر ہے۔ اُن کی شخصیت میں دلکشی ہے۔ کوئی اُنہیں مایوس نہیں کرتا۔ اُن کے چاہنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ عوام کے ہاتھوں میں اُن کی کتابیں جلد پہنچ جاتی ہیں۔ عوام ان کے

شعروں کو پڑھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے نیّر مبارکباد کے قابل ہیں۔

عابد علی خاں

مدیر روزنامہ سیاست

○

● غزل کی صنف اس قدر آزمائی جا چکی ہے۔ اس پر اتنی مشق کی جا چکی ہے کہ اس گلشن میں نئے پھول کھلانا واقعی نیّر کا ہی حق ہے۔ نیّر کے کلام میں نئی غزل کے رجحانات تمام خوبیوں کے ساتھ واضح ہیں۔ ان کے کلام میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی بڑی اچھی آمیزش کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ نیّر کی یہ خوبی ہے کہ ان کی شاعری، دورِ حاضر کی تمام کلفتوں کے ساتھ جذبوں کی لطافت بھی لئے ہوئے ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ یہ دو دھاری تلوار ہے جو سیدھے سینے میں اُتر جاتی ہے۔ ان کی شاعری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ موجودہ ذہن کو متاثر کرتی ہے۔ ان کے جذبات کی عکاسی سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ آنے والا مورخ اپنے دور کے تمدن کی جھلکیاں ان کے اشعار سے قلمبند کرے گا۔ ان کا یہ آرٹ برائے زندگی بھی ہے، برائے ادب بھی، دورِ حاضر میں ایسی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ دور حاضر میں فیض سے یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ صلاح الدین نیّر بھی اسی کارواں کے ایک مسافر ہیں جن میں دلیری بھی ہے، دل بری بھی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو ۔

پھر نئی رسمِ حلف سے یہ شروعات ہوئی - شہر میں پھر نئے قاتل سے ملاقات ہوئی
آپ دیکھئے کہ سیاست پر کتنا بھرپور طنز ہے۔ اِس شعر کی تشریح کے لئے صفحات
کے صفحات لکھے جا سکتے ہیں ۔ یہ اُردو شاعری کی خوش قسمتی ہے اور طاقت ہے۔
اصل میں غزل، چاول کے دانہ پر قُل ھو اللہ لکھنے کا آرٹ ہے۔

مُڑ کے دیکھا تو کئی کھیت ملے جُھلسے ہوئے
ہم یہ سمجھے تھے یہاں پھولوں کی برسات ہوئی

نیّر ماضی کی کثافتوں کے ساتھ ساتھ، حال کی لطافتوں سے بھی باخبر
ان کے لہجے میں جھنجھلاہٹ نہیں ہے ۔ نیّر بغاوت انگیزی کرتے ہیں۔
یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

آج تک پردہ پڑا ہے کون پس منظر میں تھا ۔ شہر جب جلنے لگا تھا میں بھی اپنے گھر میں تھا

کس قدر پُر معنی یہ شعر ہے ۔ اس کی علامت پر آپ غور فرمائیں ۔ میں اتنا
کہوں گی کہ ؎

بصد اخلاص تیری بزم میں میں بھی چلا آیا ۔ تری شائستگی کی شہر میں تشہیر ایسی تھی

اور پھر اُن کی شاعری کی بڑی خصوصیت تنگی ہے۔ یعنی ؎

تنگی لہجے کی جس دن ساز بن کر رہ گئی ۔ شخصیت اک شخص کی ممتاز بن کر رہ گئی

نیّر صاحب اپنے فن میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ "خوشبو کا سفر"
آپ خود ملاحظہ فرمائیں۔ یہ سفر جاری ہے۔

پروفیسر رفیعہ سلطانہ
ڈین فیکلٹی آف آرٹس، جامعہ عثمانیہ

○

● نیتر نے ہم پر یہ مہربانی کی ہے کہ اس گھٹے ماحول میں "خوشبو کا سفر" چھوڑ دیا ہے۔ نئے سال کے لئے نیتر صاحب نے جو تحفہ دیا ہے، اس طرح وہ ہر سال ایسا تحفہ دیتے رہیں۔ کم سے کم سو سال جئیں اور سو مجموعے چھپیں۔ وہ سالہا سال اسی طرح لکھتے رہیں۔ نیتر صاحب کی شاعری بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ بہت ہی اچھا لکھتے ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ ان کو سننے سے زیادہ پڑھنے میں لطف آتا ہے۔ میں نے ان میں دو باتیں خاص پائیں۔ جو لوگ ماضی کو دیکھ چکے ہیں، ماضی کی تکلیف اٹھا چکے ہیں یا خوشی حاصل کر چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایسے حالات اکثر لوگوں کے ذہن میں ایک کڑواہٹ چھوڑ جاتے ہیں۔ ماضی میں سکھ ہو کہ دکھ ہو، جیسے بھی کچھ دن گزارے ہوں۔ آدمی کو اداس کر دیتے ہیں۔

نیتر صاحب مجھے پہلے شاعر لگے جو ان باتوں سے گذرنے کے باوجود ان میں وہ کڑواہٹ دکھائی نہیں دیتی۔ اس طرح کی کڑواہٹ کو وہ پی جاتے ہیں۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ان کے دامن میں کتنا ہی بڑا کانٹا کیوں نہ چبھا ہو، وہ چاہے کسی کو دیکھ کر کتنے ہی آنسو بہائے ہوں، چاہے وہ آنسو، آنسو دینے والے کے دامن میں گرے ہوں، وہ اس آدمی کے نشتر کو سہہ جاتے ہیں۔ اس کے گھاؤ کو سہہ جاتے ہیں اور ان تمام اذیتوں کو خوبصورتی کے ساتھ اپنے اشعار میں پیش کرتے ہیں۔ ایسی باتیں بڑے شاعر کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ یہ بڑا پن ان کی شاعری کا ہے۔

جب میں نے نیّر صاحب کی غزلیں سُنیں تو مجھے ایسا لگا کہ اُنہیں بہت دکھ ہے۔ خاص کر پرانے شہر کے فسادات سے اُنہیں بہت تکلیف ہے۔ ایک آگ ہے جو اُن کے دامن کو سُلگا رہی ہے۔ ایک کانٹا ہے جو اُن کے دل میں چُبھ رہا ہے۔ یہ شعر دیکھئے ؎

کیا شہر تھا کس طرح سے برباد ہوا ہے
قاتل کے سوا شہر میں اب کون بچا ہے

حیدرآباد کے فسادات کے بارے میں، میں نے اُن سے کئی غزلیں سُنی ہیں۔ جب پچھلے دنوں اُن سے ملا تو محسوس کیا کہ کوئی آگ ہے جو اُنہیں جلا رہی ہے۔

پروفیسر سری رام شرما
سابق ریڈر شعبۂ ہندی، جامعہ عثمانیہ

○

● صلاح الدین نیّر، حیدرآباد کے علمی و ادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ نیّر صاحب، حیدرآباد ہی میں نہیں ہندوستان و پاکستان میں ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے ہر جگہ جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی شعری و تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ خود اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اتنی کم مدت میں انہوں نے پانچ شعری مجموعے دیئے ہیں" جن کا ہر شعری مجموعہ ایک انتخاب ہے۔ ان کا پانچواں مجموعۂ کلام "خوشبو کا سفر" بھی ان کا انتخاب ہے جو زیادہ تر غزلیہ

شاعری پر مشتمل ہے۔

نیّر ویسے نظم بھی بہت اچھی کہتے ہیں لیکن ان کو زیادہ لگاؤ غزل سے رہا ہے۔ نیّر صاحب کی شاعری کے بارے میں، ان کی غزل گوئی کے بارے میں قبل ازیں بھی ان کے ایک مجموعۂ کلام میں اظہارِ خیال کرچکا ہوں۔ اِس مجموعے کے ساتھ بھی میرا مختصر تعارف شامل ہے جس میں ان کی شاعری کے بارے میں، میں نے اپنے تاثرات قلمبند کئے ہیں۔ نیّر صاحب غزل میں اپنا ایک خاص اسلوب رکھتے ہیں ان کے منفرد لب و لہجہ کی وجہ سے الگ سے ان کی شاعری پہچانی جاتی ہے۔

اُردو کی غزلیہ شاعری میں ہم جانتے ہیں کہ غزل کی صنف میں جتنی شاعری ہوئی ہے اُن میں منفرد آواز پیدا کرنا آسان نہیں ہے۔ نیّر صاحب کی غزل پڑھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کا مزاج دوسرے شاعروں سے مختلف ہے۔ غزلیہ شاعری میں ان کے منفرد لب و لہجہ کی جداگانہ اہمیت بہت ہی نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ وہ بہت ہی پُرگو، زود گو شاعر ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ وہ انتہائی مصروفیات کے باوجود بھی تخلیقی کام کے لئے کس طرح وقت نکال لیتے ہیں۔ ان کی تخلیقی صلاحیت قابلِ رشک ہے۔

ڈاکٹر مغنی تبسّم
ریڈر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ

● "خوشبو کا سفر" اُردو کے خدمت کرنے والوں اور دانشوروں کے لئے نئے سال کا ایک نیا تحفہ ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں جو کچھ آپ ہم دیکھتے ہیں، شاعر اسی کو ایک الگ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ کسی بھی لمحے کو وہ لفظوں میں ڈھالتا ہے۔ نیّر صاحب کی شاعری میں خاص کر غزل میں ان کی گرفت مضبوط ہے۔ جذبات میں تازگی اور مترنم لب و لہجہ ان کی خصوصیت ہے۔ نیّر صاحب میں، میں نے جو خاص بات پائی وہ ان کی ماحول پر گرفت ہے۔ وہ اپنے جذبات کو مترنم لہجے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہ ان کی اپنی ایک خصوصیت ہے۔

نیّر صاحب کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے اُنہیں محسوس کیا ہے۔ مجھے ان کا کلام سُننے کا اکثر دفعہ موقعہ ملا ہے۔ وہ کسی بھی موضوع کو اس قرینہ سے پیش کرتے ہیں کہ ہمارے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ وہ اپنے ایک خاص انداز سے زندگی کے حقائق کو پیش کرتے ہیں۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ زندگی سے کس طرح کا مواد اکٹھا کیا جانا چاہیے اور وہ اس مواد کو اپنے شعروں میں سلیقے سے پیش کرتے ہیں۔ ایک کہاوت ہے کہ "جہاں نہ جائے روی، وہاں یہ جائے کوی"۔ جہاں سورج کی کرنیں نہیں پہونچ پاتیں وہاں شاعر پہونچ جاتا ہے۔

نیّر صاحب کے بارے میں اتنا ہی کہوں گا کہ اُنہوں نے اپنا مقام خود ہی بنایا ہے، اپنی محنت سے۔ ایک شخص جو سرکاری ملازم بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اتنا بڑا شاعر ہو، کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اُنہوں نے خود ہی کہا ہے کہ جب کوئی خوشبو ملی، میں نے اس کو اپنے کلام میں سمو دیا، اس کو لفظوں میں باندھا، اس لئے کہ وہ خوشبو کو جانتے ہیں پہچانتے ہیں۔ میں یہ کہوں گا کہ نیّر صاحب

زندگی کے کرب کو برداشت بھی کرتے ہیں ۔ وہ زندگی کو اچھی طرح جانتے ہیں اور وہ زندگی کی خوشبو کچھ اس طرح سمیٹتے ہیں کہ اس کی خوشبو دوسروں تک بھی پہونچ جائے ۔ وہ زندگی سے کتراتے نہیں، اس سے پیار کرتے ہیں۔ اسی پیار کی خوشبو کی وجہ سے ہی انہوں نے حیدرآباد ہی میں نہیں، ہندوستان بھر میں اپنا مقام بنایا ہے ۔ کہتے ہیں ؎

مسند نشیں ہوں آج تو حیرت ہے کس لئے ۔ فرش نگاہِ دوست بھی برسوں رہا ہوں میں

ایسی بات نیّر ہی کہہ سکتے تھے ۔ انہوں نے بڑی خوبی سے اپنی خودداری کو نبھایا ہے۔ جب کبھی وہ بدلتے ہوئے حالات کو دیکھتے ہیں تو انہیں بہت تکلیف ہوتی ہے ۔ اس خود غرضی کی دنیا میں جب وہ یہ سب کچھ دیکھتے ہیں تو انہیں لکھنا پڑتا ہے ؎

اس فصلِ گل کا ایسا ہی اک حادثہ ہوں میں ۔ پھولوں کی پتّیوں سے بھی کٹنے لگا ہوں میں

کس قدر ان کے جذبات شدید ہیں کتنا وہ محسوس کرتے ہیں اپنے ماحول کے بارے میں، اُن کے کلام سے ہمیں معلوم ہوتا ہے ۔ خود غرضی کے اندھیروں میں کس طرح زندگی پریشان رہتی ہے، ملاحظہ ہو ؎

کب تک رکھو گے مجھ کو اندھیروں میں دوستو! ۔ برسوں تمہارے شہر میں جلتا رہا ہوں میں

نیّر صاحب زندگی کا کوئی بھی پہلو ہو، اچھوتا نہیں چھوڑتے ۔ جب وہ اپنے بارے میں، قوم کے بارے میں، ماحول کے بارے میں سوچتے ہیں اور آج کی گھٹیا سیاست کو دیکھتے ہیں تو انہیں لکھنا پڑتا ہے ؎

یہ حالت کبھی نہ اسیروں کی ہوتی ۔ حکومت اگر ہم فقیروں کی ہوتی

کاش حکومت فقیروں کی ہوتی تو آج کا ہمارا ماحول کچھ اور ہی ہوتا۔
ان کی زندگی کا فلسفہ ان کے قلم سے پیش کرتا ہوں ؎

اتنا ہے بس اب یاد کہ دو ہاتھ ملے تھے
کیا میں نے لیا تھا مجھے کیا تم نے دیا تھا

زندگی میں کوئی کسی سے کچھ لیتا ہے نہ دیتا ہے ، لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو زمانے میں اپنی چھاپ چھوڑ جاتے ہیں۔ اچھا ہو یا بُرا اپنا اِنسپائیریشن چھوڑ جاتے ہیں ۔

ڈاکٹر موہن لال نگم
ڈائرکٹر سالار جنگ میوزیم

کچھ تبصروں سے اقتباسات اور منتخب تحریریں

پروفیسر سید مبارز الدین رفعت

شعر گوئی کے اس بے ہنگم غوغا میں کچھ آوازیں اپنی انفرادی اور اپنی لے کی دل آویزی سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر ہی لیتی ہیں۔ یہ موزوں طبع ناظموں کے نہیں اصلی اور حقیقی شاعروں کی آوازیں ہیں۔ ایسے ہی شعراء میں جن کی دلآویز لے نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے، حیدرآباد کے جواں سال اور ابھرتے ہوئے شاعر صلاح الدین نیر بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے دلکش کلام اور دل آویز لے سے بہت جلد شعر فہموں اور سخن سنجوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔

ابھی حال ہی میں ان کے کلام کا منتخب مجموعہ "گلِ تازہ" کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔ نیر صاحب کی شعر گوئی کی عمر کچھ زیادہ نہیں لیکن اس مختصر سی مدت میں جتنا بھی انہوں نے کہا ہے، بہتوں کے بہت کچھ کہے ہوئے پر بھاری ہے۔

"گلِ تازہ" جیسے ادبی تحفے پر ہی غالبؔ "بقامت کمتر بقیمت بہتر" کا مقولہ صادق آتا ہے۔

خوشبو کا سفر

(رسمِ اجراء تقریب کے موقع پر اظہار رائے)

(۱۹۸۴ء)

○ ڈاکٹر سی۔ نارائن ریڈی ○ عابد علی خاں ○ پروفیسر رفیعہ سلطانہ

○ ڈاکٹر سری رام شرما ○ ڈاکٹر مغنی تبسم ○ ڈاکٹر موہن لال نگم

◎

● صلاح الدین نیر صاحب سے میں تقریباً ۱۵ سال سے واقف ہوں۔ اُن سے دوستی ہے۔ دو سال سے تو سکریٹریٹ میں وہ میرے آس پاس ہی رہتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ میرے کمرہ پر ٹوٹ پڑتے ہیں، کبھی انگریزی کے بارے میں، کبھی تلگو کے بارے میں اور کبھی اُردو کے بارے میں گفتگو ہوتی رہتی ہے لیکن ہماری گفتگو کمرہ سے باہر نہیں جاتی۔

نیر صاحب پھول کے اچھے پریمی لگتے ہیں۔ پھولوں سے اُنہیں محبت ہے دیکھئے نا پہلا مجموعہ ۱۹۶۵ء میں "گُلِ تازہ" عنوان ٹھیک ہے۔ بعد میں "زخموں کے گلاب"

نیّر صاحب کے کلام میں ہر طرف نشاطِ غم کی چاشنی بکھری ہوئی ہے۔ لذتِ غم کا بیان مریضانہ بھی ہو سکتا ہے اور صحت مندانہ بھی۔ اُردو شاعری پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ اس کے بیشتر شعراء کے یہاں لذتِ غم کا بیان نفسیاتی بیماری بن گیا ہے۔ لیکن خوشی کی بات ہے کہ نیّر صاحب کے یہاں یہ مریضانہ رجحان نہیں پایا جاتا، ان کے یہاں لذتِ غم کا بیان ہر طرح صحت مندانہ ہے۔

نیّر صاحب غزل کے شاعر ہیں اور ان کا پہلا مجموعہ کلام بس غزلوں ہی کا گلدستہ ہے۔ غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس کا ہر شعر اپنی جگہ ایک اکائی اور ایک مکمل نظم کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیّر صاحب کی بیشتر غزلیں مسلسل نہ ہونے کے باوجود غزلِ مسلسل ہی کی ذیل میں آتی ہیں۔ کیونکہ وہ اکثر ایک ہی خیال ایک ہی تصور اور ایک ہی کیفیت کو اپنی غزل میں پیش کرتے ہیں، اس لیے ان کی غزل پریشان خیالوں کا مجموعہ نہیں معلوم ہوتی۔ پوری غزل پڑھ لینے کے بعد ایک ہی تاثر اور ایک ہی کیفیت قاری پر طاری ہوتی ہے۔

"گلِ تازہ" خود ہی منتخب کلام کا مجموعہ ہے اس کا انتخاب پیش کرنا اس شگفتہ پھول کی پنکھڑیوں کو الگ الگ کر دینا ہے۔ اس گلِ تورستہ کا مکمل طور پر نظارہ کرنا چاہیے۔ پورے پھول کو سونگھنا چاہیے، تب ہی اس کی رعنائی اور اس کی خوشبو کی دل آویزی کا پورا پورا اندازہ ہو سکے گا۔

نیّر صاحب کی شعری صلاحیتوں سے بڑی خوشگوار امیدیں وابستہ ہیں، ان کی اُبھرتی ہوئی شعری صلاحیتیں مستقبل کے ایک دیدہ ور شاعر کی نوید دے رہی ہیں۔

(۱۹۶۶ء)

شاہکار (ڈائجسٹ) الٰہ آباد

صلاح الدین نیر کی شاعری کی عمر ابھی زیادہ نہیں۔ اس میں سے بھی انہوں نے انتخاب کرکے صرف پانچ سال کے اندر لکھی ہوئی غزلوں کا مجموعہ پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری سراسر وارداتِ دل کی شاعری ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف انھوں نے اپنے دیباچہ 'سرگزشتِ دل' میں بھی کیا ہے۔ اور اس کا اندازہ پڑھنے والوں کو ان کی غزلوں سے بھی ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ غزل اکثر و بیشتر وارداتِ قلبیہ کا بیان ہی رہی ہے لیکن اس میں گہرائی اور ہمہ گیری پیدا کرنے کے لئے کچھ اور وسیع النظری پیدا کرنا ضروری ہے۔ اس مجموعہ میں محبت کے ابتدائی ہیجان سے پیدا ہونے والی اُمنگوں اور ناکامیوں سے متعلق بہت خوبصورت اشعار مل جائیں گے۔ مجھے اُمید ہے کہ نیرؔ کی شاعرانہ طبیعت اس سے زیادہ گہرا رنگ پیدا کرلے گی۔

پروفیسر سید احتشام حسین (صدر شعبۂ اُردو الٰہ آباد یونیورسٹی)
(۱۹۶۷ء)

○

ساقی (پاکستان) ماہنامہ

صلاح الدین نیرؔ ایک حساس نوجوان ہیں۔ انھوں نے حسن کی رعنائیوں کو بڑی حد تک محسوس کیا ہے۔ ان کی شاعری اسی احساس کا پرتو ہے۔ غزل کے روایتی عاشق کی طرح ان کا مقدر بھی محرومیاں اور حرماں نصیبی ہے ؎

ہم تو صحرا نصیب ہی ٹھہرے ۔ تیرا کیا ہوگا اے گلِ تازہ!

حیاتِ عشق کا بڑا سرمایہ محبوب کا خیال ہوتا ہے۔ غمِ دوراں اور زیست کی دیگر بدعنوانیوں کو بھلانے کے لئے عشاق خیالِ گیسوئے یار میں کھو جاتے ہیں۔ اب اسے راہ فرار کہئے یا حکمت عملی۔ نیرؔ کا شانۂ دل کو یادِ یار کی شمع سے منور کرتے ہیں۔ ؎

جب گوشۂ دل میں ہوا اندھیرا کبھی نیرؔ ۔ اُن کے لب و رخسار سے کچھ روشنیاں لوں گا

"گلِ تازہ" ان کی ابتدائی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ تاہم اس میں جاذبیت موجود ہے۔ ان کی غزلوں میں اکثر شعر پڑھنے والوں کو متوجہ کر لیتے ہیں۔ البتہ قاری کو یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ شاعر نے وہ پختگی بہم پہنچانے کی کوشش نہیں کی جو اس کے کلام کو دوآتشہ بناتی۔ ان کی کچھ غزلیں رجائی اور حیات افروز ہیں۔ وہ حسن کی رعنائیوں سے خانۂ دل کو سجاتے ہیں اور زندگی میں رنگ بھرتے ہیں۔ ان کا کلام وارداتِ قلبی اور احساس پر مبنی ہے ؎

ہر شعر مرا پرتوِ احساس ہے نیرؔ ۔ جو دل پہ گزرتی ہے وہی بات کہوں گا

(۱۹۶۶ء) (ادارہ)

○

روحِ ادب (ڈائجسٹ) کلکتہ

"گلِ تازہ" صلاح الدین نیرؔ کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ جیسا کہ مصنف نے خود اعتراف کیا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کی مسرتوں اور غموں کو گلِ تازہ میں سمو دیا

ہے۔ گویا یہ "گلِ تازہ" اشک و تبسم کا امتزاج ہے۔ اس مجموعے کے صفحات پر بکھری ہوئی غزلیں بجائے خود ایک فکری تسلسل ہیں جو قارئین کو یہ بتانے کی کوشش کرتی ہیں کہ حقیقت میں غزل کو اس کے نادان دوستوں نے بدنام کیا ہے ورنہ اگر فکر کو راہ دی جائے تو غزلیں بھی دل و دماغ کی سرحدوں کو چھو سکتی ہیں۔

نیر نے اس مجموعے میں اپنی نمائندہ غزلوں کے ذریعہ غزل کے خلاف اٹھائے ہوئے طوفانوں کا جواب دیا ہے۔ ان کی غزلوں میں زندگی کی لگن، محبت کا گداز اور زمانے کے انقلاب کا تاثر سبھی کچھ موجود ہے اور صرف موجود ہی نہیں ہے بلکہ نیر نے ان تمام چیزوں کو فنکارانہ انداز میں پیش کر کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔

(راقم لکھنوی) اپریل ۱۹۶۷ء

○

سیارہ (پاکستان) ماہنامہ

جناب صلاح الدین نیر (مرحوم وکن) کے نوجوان شاعر ہیں، اور گزشتہ آٹھ برس سے باقاعدگی سے کہہ رہے ہیں۔ زیرِ تبصرہ مجموعہ میں ان کی غزلیات شامل ہیں۔ ضخامت (۱۱۲) صفحے، پیپر عمدہ، سرورق دلکش، قیمت ایک روپیہ۔ رنگینی لطافت اور رچاؤ وہ خوبیاں ہیں جو اشعارِ نیر میں دامن کشِ دل ہوتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یادوں کے کتنے رنگ محل پچھلی رات میں
پلکوں پہ میری نیلم و یاقوت جڑ گئے

جب کبھی دل میں خیالات حسیں آتے ہیں
کتنے بھولے ہوئے غم دل کے قریں آتے ہیں